جنوری ۲۰۲۲ء

جلد نمبر ۲۰۹—عدد ۱

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

ISSN 0974-7346

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپے۔فی شمارہ ۳۰؍روپے۔رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰روپے۔دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰روپے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰روپے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں :

Hafiz Sajjad Elahi
196 - Ahmad Block, New Garden Town, Lahore (Punjab) Pakistan
Tel: 0300-4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔

بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Tel. (Ma'arif Section) 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹　　ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۲ء　　عدد ۱

مجلس ادارت

مولانا سید محمد رابع ندوی
لکھنؤ

پروفیسر شریف حسین
قاسمی دہلی

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
علیگڑھ

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

فن تاریخ یا تاریخ نگاری کے متعلق شاید اتنے ہی اقوال و تعریفات ہیں جتنے انسانی تاریخ کے نشیب و فراز ہیں۔ رفت و گزشت کو حاضر و موجود کی شکل میں پیش کرنے کے عمل کو کبھی انسانی فطرت کا خاصہ کہا گیا کبھی یہ فن زمانوں کا شاہد اور قدامت کا قاصد کہلایا۔ تاریخ کو فلسفیانہ نظر سے دیکھنے والوں نے اس کو شاعری سے کم تر اس لئے قرار دیا کہ شاعری میں امور عامہ کا ذکر ہوتا ہے اور وہ فلسفہ سے بھری ہوتی ہے جب کہ تاریخ صرف خصوصیات کے بیان تک محدود ہے، واقعات جیسے ہیں تاریخ صرف ان کے بیان کا نام ہے۔ شاعری بتاتی ہے کہ واقعات کیسے ہونے چاہئیں۔ کچھ لوگ فلسفہ اور شاعری سے بے نیاز ہو کر خود استفساری کے عالم میں سوال کرتے ہیں کہ تاریخ کیا محض انسان کے ذہنی تجسس کی تسکین ہے؟ تاریخ کی تاریخ سے پردہ اٹھانے والے الگ الگ لہجوں میں اپنی عقلی استعداد کا اظہار کرتے رہے وہ اس عام کلیہ سے اتفاق کرتے رہے کہ تاریخ ظاہر میں زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن دوسرے ہی جملہ میں اس خاص کیفیت کے اظہار میں تاخیر نہیں کی کہ باطن میں تاریخ نام ہے نظر و تحقیق کا، اس کا رشتہ سبب اور مسبب سے ناگزیر ہے۔ شاید اسی لئے یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ تاریخ کے ساتھ سطحی سلوک کرتے ہیں وہ غیبی سزا کے مستحق ہیں، کیوں کہ تاریخ وجود الٰہی کا ثبوت ہے، تاریخ کو مقدس فن سمجھنے والوں کے نزدیک تاریخ میں خدا کا وجود اور اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انسانی معاشروں کی ہر حرکت اور اتار چڑھاؤ میں تاریخ خدا کی موجودگی کی صراحت کرتی ہے۔ ایسے خیالات، مذہب اور اس کی تعلیمات کے دیکھنے اور سمجھے جانے کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑی مذہبی کتاب میں تاریخ، عبرت اور نصیحت کے بنیادی ماخذ کی حیثیت سے نظر آتی ہے اور اسی سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ تاریخ کے جز و اصل تک پہنچنے کے لئے عبرت و بصیرت و نصیحت کا حصول تب ہی ممکن ہے جب مورخ میں یا بیان تاریخ میں تنقیدی نظر، باریک بینی اور تہہ تک رسائی کی خوبی شامل ہو۔ قرآن مجید کی یہ آیت شاید سارے مباحث تاریخ کا خلاصہ یا جوہر ہے کہ رات دن کی الٹ پھیر صرف اللہ کے حکم سے ہے، گردش لیل و نہار میں عبرت ان کے لئے ہے جو اولی الابصار ہیں۔

****

تاریخ سے متعلق ایسے خیالات کے جاننے اور بتانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ہمارے سیکولر اور سوشلسٹ

آئین والے ملک کے سب سے بڑے ذمہ دار ایک مذہبی تقریب میں نہایت کروفر سے شامل ہوئے۔اس بات سے قطع نظر کہ پورے ملک کی حکمرانی اور ہر طبقہ کی پاسبانی کا عہدہ اس قسم کی تقریبات میں شامل ہونے کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ جواز کسی حد تک اس لئے ہے کہ ایسے موقع پر مذہبی مقامات و مآثر کی اہمیت اور مذہبی نقطہ نظر سے اس کی ضرورت یا اس علاقہ و مقام کی تاریخی قدامت کا ذکر کیا جائے۔ مگر ہمارے وزیر اعظم نے اس موقع پر قریب پچاس منٹ کی تقریر میں مذہب و تہذیب و تاریخ کی گرہوں کو کھولنے کی حسب عادت بے ضرورت کوشش کی اور لے دے کے ایسے ذہنوں کو جو یاد رہ جاتا ہے اسی سبق کو دہرانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ فرمایا کہ ''اورنگ زیب نے تلوار کے زور پر تہذیب کو برباد کرنے کی کوشش کی، ناکام اس لئے رہا کہ اس ملک کی مٹی باقی دنیا سے الگ ہے۔ کسی اورنگ زیب کے آنے پر کوئی شیواجی کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ سالار مسعود غازی کے سامنے سہیل دیو جیسے بہادر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وقت کا پہیہ ایسا چلا کہ دہشت کی علامتیں، تاریخ کے صفحات میں سمٹ گئیں''۔ واوین کی یہ عبارت بنارس کے ایک ہندی اخبار ''ہندوستان'' میں نمایاں طریقہ سے موجود ہیں، بجا طور پر ایسے خیالات کو اصول تاریخ اور فہم تاریخ کے حوالے کیا جاسکتا ہے، شاید وہاں سے وہی جواب آئے جو اوپر ایک جملہ میں موجود ہے کہ یہ تاریخ کے ساتھ سطحی سلوک ہے اور اپنے اثرات بد کے لحاظ سے غیبی سزا کا مستحق ہے۔ اکثر یہ باتیں موضوع بحث بنتی رہتی ہیں کہ تاریخ کو داستان اور داستان کو افسانہ بنانے کی دانستہ کوششیں ہوتی ہیں تو کیوں؟ کیا اقتدار کا ناجائز اثر اور استعمال اس کی اجازت دیتا ہے کہ افسانہ کو تاریخ بنایا جائے اور تاریخ کو افسانہ بتایا جائے؟ گذشتہ صدی سے ایک طبقہ یہ برابر باور کراتا رہا کہ تاریخ کے ساتھ یہ بدسلوکی اصلاً مغربی استعماری فکر یا نوآبادتی طرز فکر ہے، دلیل میں صاحب نظر تاریخ دانوں نے ہندوستان میں استعمار کے تسلط کے لئے اور ہندو مسلم کی تفریق کی خاطر افسانہ کو داستان اور پھر تاریخ میں بدلنے کی اس کی کوشش کو بار بار بے نقاب کیا۔ اورنگ زیب کی ستم گری، ہندوکشی اور عبادت خانوں کی پامالی کے افسانوں کو تاریخ کے صفحات میں دیدہ دلیری سے شامل کرنے پر معارف نے بار بار تاریخ کے حوالوں سے گفتگو کی، بتایا کہ آج کتنے مندر ہیں جو اس بت شکن بادشاہ کی فیاضی کی بدولت آباد ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں مہاراشٹر کے پربھنی علاقہ میں مندر سے ایک پگڑی چوری ہوئی تھی، معلوم ہوا کہ یہ جواہرات سے جڑی ہوئی نہایت بیش قیمت پگڑی، عالم گیر نے مندر کو تحفہ میں دی تھی۔ جو سال میں ایک بار مندر کے

مرصع تخت پر درشن کے لئے رکھی جاتی تھی۔ خود وزیراعظم جس مقام پر تاریخ کے نام پر اپنے جذبات کا سیل جاری کئے ہوئے تھے۔ اسی معبد کے نام اورنگ زیب کی فیاضی کے دستاویز موجود ہیں۔ رہا شیوا جی کا مقام تو تاریخ کی گواہی ہے کہ شیوا جی کو سب سے زیادہ مدد بیجاپور کی مسلم ریاست سے ملتی تھی، اس کی فوج کے توپ خانہ کا سارا انتظام مسلمان افسروں کے ہاتھوں میں تھا، عربوں کی بحری فوج مرہٹوں کے ساتھ تھی۔ خوب کہا گیا کہ یہ اچھی کفر و اسلام کی جنگ تھی جس میں اسلام کی طرف سے کفر اور کفر کی طرف سے اسلام شمشیر بکف اور نبرد آزما تھا۔ بات تو یہی ہے ''جو لوگ سیاسی پروپیگنڈہ سے متاثر نہیں ان کی نظر میں عالم گیر بادشاہ تھا اور بس، اب نہ تو عالم گیر ہے نہ عالم گیری، اب جو عالم گیر ہندو اور مسلمان کے سروں پر مسلط ہے اس کی طرف نظریں متوجہ ہونی چاہئیں''۔ تاریخ کے ساتھ سطحی سلوک، ہر برے سلوک کی طرح ایک جرم ہے، تاریخ کو سیاست کا آلہ کار بنانا ہمیشہ ناپسندیدہ عمل رہا ہے اور رہے گا۔

****

افسوس ملت ایک مخلص مصنف و مفکر سے محروم ہوگئی۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی نے ایک طویل عمر اور ادھر ایک مستقل علالت کے بعد دنیا کو خیر باد کہا۔ اسلام کے لئے اپنے قلم کو وقف کرنے میں ساری زندگی گزار دی، بیسوں مفید کتابیں لکھیں۔ آداب زندگی تو مقبول ترین کتاب ثابت ہوئی۔ رسالہ ذکریٰ ان کے ذکر کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ملت کے ایک اور غمگسار اور دین کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف زندگی کی قابل تقلید مثال ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی بھی وفات پاگئے۔ تعلیم و تدریس میں اور تحریر تقریر میں عمر گزاری۔ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت فرمائی۔ عالم شباب میں ندوہ سے رشتہ استوار ہوا تو قریب ۹۰ سال کی عمر تک وہیں کے ہو رہے۔ بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اب ایسے لوگ کہاں، اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ مولانا عبدالرشید قاسمی بھی راہی ملک بقا ہوئے۔ وہ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ کے مہتمم اور مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کے گویا دست راست تھے۔ شرافت اور صالحیت میں نمونہ سلف تھے۔ وہ ان میں سے تھے جن کی نیک نامی سے ادارے نیک نام ہو جاتے ہیں۔ رحمہم اللہ۔

****

مقالات

ہند میں سلسلۂ شطاریہ کے بانی

حضرت عبداللہ صدیقی شطاری مانڈوی: حیات وخدمات

بشارت علی صدیقی اشرفی

اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن، حیدرآباد دکن

rarepersianbooks@gmail.com

سلسلہ شطاریہ، ہندوستانی صوفی سلاسل میں ایک نمایاں سلسلہ ہے جس کے خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بر صغیر میں اس سلسلہ کو کافی شہرت ومقبولیت بھی حاصل ہوئی، جس کا سہرا ہندوستان میں اس سلسلہ کو متعارف کروانے والے عظیم صوفی بزرگ حضرت شاہ عبداللہ شطار صدیقی بخاری مانڈوی (م: ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) اور اس سلسلے کے جلیل القدر مبلغین حضرت ابو محمد قاضن علاء شطاری (م: ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء) حضرت سید غوث محمد گوالیاری (م: ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) اور حضرت سید وجیہ الدین علوی احمد آبادی گجراتی (م: ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء) جیسی شخصیات کے سر جاتا ہے۔

مختصر تاریخ سلسلہ شطاریہ

ہندوستان کے مقتدا صوفیا میں ایک نمایاں نام غوث العالم قدوۃ الکبریٰ حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی (م: 832ھ/1429ء) کا بھی ہے۔ آپ حضرت عبداللہ شطار کے معاصر تھے۔ مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے سلسلہ شطاریہ کی تعلیمات دو بزرگوں سے حاصل کی تھیں:

۱- شیخ محمد عارف ابن محمد العاشق؛ جو حضرت عبداللہ شطار کے بھی شیخ ارادت وخلافت ہیں، اور

۲- مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین حسین بخاری اوچی۔

مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی، سلسلہ شطاریہ کے تعارف وتاریخ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

س سلسلہ کا آغاز حضرت شیخ الشیوخ [شہاب الدین سہروردی] سے ہوا ہے۔ حضرت قدوۃ الکبریٰ

فرماتے تھے کہ ہر چند یہ سلسلہ مشہور نہیں ہے لیکن اس سلسلہ کے بعض اذکار اس قدر مؤثر ہیں کہ طالب صادق حق تعالیٰ سے اس راستہ کو جلد طے کرنے کی توفیق پالیتا ہے، یہ سلسلہ حضرت خدا قلی ماوراء النہر کے نام سے مشہور ہے، اس سلسلہ کی کڑیاں یہ ہیں: حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو، ان سے امام زین العابدین کو، ان سے امام محمد باقر کو، ان سے امام جعفر صادق کو، ان سے سلطان العارفین بایزید بسطامی کو، ان سے شیخ المعظم خواجہ محمد صغری کو، ان سے خواجہ اعرابی مزید [ابویزید] عشقی کو، ان سے ابوالمظفر مولانا ترک طوسی کو، ان سے شیخ ابوالحسن خرقانی کو، ان سے شیخ المعظم والمحترم ولمکرم خدا قلی ماوراءالنہری کو، ان سے شیخ حاجی محمد بن عارف القاری کو اور ان سے یہ فقیر جس کا نام ''اشرف'' ہے، فیضیاب ہوا۔ [1]

مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے اس سلسلے کی دوسری مشہور و معروف کڑی کے متعلق فرمایا:

اس خاندان کا ایک اور سلسلہ حضرت شیخ الشیوخ [شہاب الدین سہروری] کی اولاد کبار سے جاری و ساری ہوا جس کی تفصیل یہ ہے: حضرت عمر معروف شیخ الشیوخ سے، شیخ حماد کو پہنچا، ان سے شیخ نجم الدین کو، ان سے شیخ ضیاء الدین کو، ان سے شیخ رشید الدین کو، ان سے شیخ حسام الدین کو، اور ان سے شیخ عبداللہ شطار نے اکتساب فیض کیا۔ یہ سلسلہ شیخ الشیوخ کے فرزندوں سے اباًوجداًمتصلاً منتقل ہوتا رہا یعنی عن فلان عن جای رہا اور ان سے ہندوستان میں پھیلا، میں نے ان حضرات کو ولایت [بیرون ملک] میں دیکھا تھا۔ انھوں نے مشارب صوفیہ سے بہرۂ وافر پایا ہے۔ [2]

سلسلہ شطاریہ اور سلسلہ نقشبندیہ کا آپسی تعلق

ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

---

[1] نظام الدین غریب یمنی، لطائف اشرفی فی طوائف صوفی، مترجم: شمس بریلوی، ہاشم رضا اشرفی، کراچی، جون ۱۹۹۹ء، ج:۱، لطیفہ :۱۵؛ص:۶۰۶-۶۰۷۔

[2] ماخذ سابق، ج:۱، لطیفہ :۱۵؛ ص:۶۰۶-۶۰۷۔ نوٹ: لطائف اشرفی مترجم میں کاتب یا کتابت کی غلطی کی وجہ سے شیخ حسام الدین [شطاری] کا نام شجرے میں حضرت عبداللہ شطار کے بعد تحریر ہو گیا ہے، جب کہ شیخ حسام الدین، شیخ عبداللہ شطار کے والد گرامی ہیں، اور شیخ حسام الدین کے ساتھ شطاری لکھا ہے جو کہ درست معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ لقب شطار سے سب سے پہلے حضرت عبداللہ شطار ملقب ہوئے ہیں۔ ہم نے یہاں عبارت نقل کرتے ہوئے درست کر دیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی سے منسوب کئی دوسرے سلاسل اور ان کی چند شاخیں بھی اپنی روحانی خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ فردوسیہ، نقشبندیہ اور شطاریہ سلاسل جو سلسلہ خواجگان سے متعلق ہیں اور جن کی نسبت بایزید بسطامی ہے، اپنی روحانی خصوصیت کی وجہ سے موسوم ہیں۔ مخدوم شعیب فردوسی کا خیال ہے کہ چونکہ شیخ رکن الدین ''فردوسی'' کے نام سے مشہور ہوئے؛ لہذا ان کا سلسلہ ہندوستان میں فردوسیہ کے نام سے معروف ہوا۔

نقشبندیہ اور شطاریہ سلاسل دونوں خواجہ حسن خرقانی کے ذریعے چند واسطوں سے خواجہ بایزید بسطامی پر منتہی ہوتے ہیں، جو سلسلہ خواجہ حسن خرقانی سے بواسطہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی، امیر کلال اور پھر چند واسطوں سے خواجہ بہاء الدین نقشبند پر منتہی ہوا۔ ''نقشبندیہ'' کے نام سے شہرت پایا اور جو سلسلہ حسن خرقانی سے خواجہ خدا قلی ماوراءالنہری کے ذریعے شاہ عبداللہ شطار کو پہنچا ''شطاریہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ [3]

سلسلہ شطاریہ کی وجہ تسمیہ

صاحب تذکرہ ''مرآۃ الاسرار''۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتی، شطار کے معنی میں لکھتے ہیں:

شطار کے معنی تیز رفتار کے ہیں اور صوفیہ کی اصطلاح میں علم شطار شغل باطنی کو کہتے ہیں، جس سے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ [4]

اور شیخ عبدالرحمٰن چشتی، علم شطار اور مشرب شطار کے متعلق بیان کرتے ہیں:

کتاب جواہر خمسہ میں لکھا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: نزل علم الشطار قبل الفرقان فی صدری فتحققت حقیقۃ الاشیاء من الازل الی الی الابد۔'' ترجمہ: میرے سینہ میں علم شطار قرآن سے پہلے نازل ہوا اور ازل سے ابد تک مجھے حقیقت الاشیاء سے آگاہی ہو گئی۔ پس یہ علم شطار حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پہنچتا ہے اور آپ سے صوفیاء کرام کو حاصل ہوا؛ اس وجہ سے شغل باطن تمام سلاسل کا معمول

---

3 فضیل احمد قادری، تاریخ مشرب شطار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص: ۴-۵۔

4 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء؛ ص: ۱۲۲۲۔

ہو گیا۔ [5]

سلسلہ شطاریہ کے دیگر نام

صاحب تذکرہ ''گلزار ابرار'' حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں ''اِس سلسلہ کو ایران اور توران میں عشقیہ اور دار الملک روم میں بسطامیہ کہتے ہیں''۔ [6]

شطاری کہلانے کی وجہ

حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

> اس سلسلہ کے پیروں کو شطاری اس سبب سے کہتے ہیں کہ شطاری مشائخ شاہراہ طریقت کے سلوک مین دوسرے خانوادوں کے مشائخ سے زیادہ تیز، اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں جوان کا اول قدم ہوتا ہے وہ دوسرے درویشوں کا اخیر قدم ہوتا ہے۔ [7]

شاہ عبداللہ کا لفظ شطار سے ملقب ہونا

صاحب تذکرہ ''مرآۃ الاسرار''۔ شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں کہ سلسلۂ طیفوریہ میں سب سے پہلے آپ نے شطار کا لقب حاصل کیا۔ [8]

ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

> سلسلہ طیفوریہ بسطامیہ کے اول ترین بزرگ جو ''شطار'' کے نام سے مشہور ہوئے ''شاہ عبد اللہ'' ہیں۔ انھوں نے ریاضت کے بعد ''شغل علم شطار'' حاصل کیا تھا، چنانچہ ان کے پیر شیخ عارف انھیں ''عبداللہ شطار'' کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ یوں سلسلۂ شطاریہ ان سے منسوب ہوا

---

[5] ماخذ سابق، ص: ۱۲۲۲۔

[6] غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۱۔

[7] ماخذ سابق، ص: ۱۶۳۔

[8] شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء؛ ص: ۱۲۲۲۔

اور اس کی ترویج و اشاعت ہوئی۔[9]

شیخ عبدالرحمٰن چشتی، حضرت عبداللہ شطار کے متعلق لکھتے ہیں:

جب شیخ عبداللہ کو غایت ریاضت و مجاہدہ سے علم شطار کماحقہ حاصل ہو گیا اور آپ اسی حقیقت سے موصوف ہو گئے، تو شیخ محمد عارف نے آپ کو شیخ عبداللہ شطار کا لقب عطا فرمایا۔ چنانچہ سلسلہ شطاریہ آپ کے نام سے شروع ہوا۔ آپ کے مریدن بھی اسی نام سے موسوم ہیں۔[10]

مشہور محقق، ڈاکٹر سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی صاحب لکھتے ہیں ''سلسلہ شطاریہ ان تمام فیوض و برکات کا مجموعہ ہے جو حضرت شیخ عبداللہ شطاری کی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے''۔[11]

حضرت عبداللہ صدیقی شطاری مانڈوی: احوال و آثار

مقالے کی اس حصے میں ہم بانی سلسلہ شطاریہ حضرت عبداللہ شطار مانڈوی کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے، جو حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی (م: ۸۳۲ھ/۱۴۲۹ء)، مخدوم جہانیاں جہان گشت (م: ۷۸٦ھ/۱۳۸۴ء)، مخدوم دکن حضرت بندہ نواز گیسو دراز (م: ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء)، اور مخدوم کشمیر حضرت میر سید علی ہمدانی (م: ۷۸٦ھ/۱۳۸۴ء) جیسی عبقری شخصیات کے ہم عصر تھے۔

نام، نسب و لقب

حضرت عبد اللہ شطار مولوداً بخاری خراسانی اور نسلاً صدیقی تھے، حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین محمد عمر سہروردی کے نسل پاک سے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

حضرت اعلیٰ آپ کا لقب ہے۔ آپ حسام الدین کے بیٹے ہیں۔ جن کا سلسلہ [نسب] اس طرح پر ہے: حسام الدین ابن رشید الدین ابن ضیاء الدین ابن نجم الدین ابن جمال الدین ابن شیخ الشیوخ

---

9 فضیل احمد قادری، تاریخ مشرب شطار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹٦ء، ص: ۷-۸۔

10 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ؛ ص: ۱۲۲۲۔

11 سید شمیم الدین احمد منعمی، معدن الاسرار فی بیان خاندان مشرب شطار، تعارف، تجزیہ اور ترجمہ؛ سہ ماہی انوار مخدوم، شمارہ، ٦، ص: ۹۷۔

شہاب الدین عمر سہروردی۔[12]

جناب قاضی معین الدین احمد نے اپنے پی ایچ ڈی مقالے میں حضرت عبداللہ شطار کے نسب کے متعلق ان مخطوطات کا حوالہ بھی پیش کیا ہے: لطائف غیبیہ (مخطوط:۷)؛ معدن الاسرار (مخطوط:۸)؛ معارج الولایت (مخطوط: ج:۲؛ص:۵۴۲)۔[13]

سن ولادت

حضرت عبداللہ شطار کے سن و جائے ولادت اور دیگر ابتدائی کوائف پر تاریخی وتذکراتی کتب میں کوئی صریح عبارت موجود نہیں ہے۔ ''گلزار ابرار''، جو ہندوستانی اور شطاری صوفیا پر ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے، میں بھی اس تعلق سے کوئی تفصیل نہیں ہے۔ شیخ محقق حضرت عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور زمانہ کتاب ''اخبار الاخیار'' فارسی میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ''اخبار الاخیار'' کے مترجمین نے حضرت عبداللہ شطار کا سن ولادت ۱۵۰۶ء لکھا ہے۔ اس اہم تاریخی بات کا اصل ماخذ و مصدر کیا ہے اس پر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ یہ سن ولادت کسی طرح درست نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس سے سال پیدائش ۹۱۲ ہجری نکلتی ہے، اور گلزار ابرار کے مطابق ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں حضرت عبداللہ شطار کا وصال ہو چکا تھا۔ نیز آپ کا مخدوم سید اشرف جہانگیر (م: ۸۳۲ھ/۱۴۲۹ء)، شیخ حسام الدین مانک پوری (م: ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء) اور سلطان ابراہیم شرقی (م: ۸۴۳ھ/۱۴۴۰ء) اور سلطان محمود شاہ خلجی اول (۸۳۹-۸۷۳ھ، ۱۴۳۶-۱۴۶۹ء) سے ملاقات تاریخی کتب سے ثابت ہے۔[14]

سن ولادت کا قیاسی تعین

حضرت عبداللہ شطار کے سن وصال پر سبھی سوانح نگار متفق ہیں کہ وہ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء ہے۔ اس بنیاد پر اور دیگر تاریخی واقعات کی بنیاد پر آپ کی سن ولادت کسی حد تک متعین کی جا سکتی ہے۔ حضرت عبداللہ شطار کا حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کبروی [۷۱۴-۷۸۶ھ/۱۳۱۴-۱۳۸۴ء] سے استفادہ کرنا اور سلسلہ سہروردیہ کبرویہ

---

12 غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۱۔

13 قاضی معین الدین احمد، *History of the Shattari Silsila*، پی ایچ ڈی مقالہ، شعبۂ تاریخ، ۱۹۶۳ء، ص: ۱۔

14 شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، مترجمین: مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، اکبر بک سیلرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۷۲۔

میں خلافت پانا گلزار ابرار اور دیگر شطاری لٹریچر سے متحقق ہے۔ اسی طرح امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کا ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں پردہ کر جانا مشہور و معروف ہے۔ اس بنیاد پر اگر یہ مان لیا جائے کہ بوقت خلافت و اجازت حضرت عبداللہ شطار کی عمر ۲۵ سال تھی، تو آپ کی سن ولادت ۷۶۱ھ/۱۳۵۹ء ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح حضرت عبداللہ شطار کی عمر ۱۲۹ سال کے قریب ہو سکتی ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔ حضرت عبداللہ شطار کی جائے ولادت کے تعلق سے بس اتنی صراحت ملتی کہ آپ کی پیدائش بخارا، خراسان کے علاقے میں ہوئی تھی۔

بیعت و خلافت

حضرت عبداللہ شطار کے ابتدائی حالات کے بارے میں تاریخی و تذکراتی کتب خاموش ہیں۔ ہمیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے حضرت شیخ محمد عارف [عشقی] سے سلوک و تصوف میں تربیت پائی اور انھیں کے زیر سایہ منازل سلوک و عرفان طے کئے تھے۔ حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

> [حضرت عبداللہ شطار] شیخ محمد عارف کے خلیفہ ہیں، جن کو شیخ محمد عاشق سے خلافت تھی، ان کو اپنے باپ شیخ خدا قلی ماوراء النہری سے، ان کو شیخ ابوالحسن عشقی سے، اِن کو مولانا ابوالمظفر ترک سے، اِن کو شیخ ابو یزید اعرابی سے اور ان کو سلطان العرفا شیخ ابویزید بسطامی سے تھی، قدس اسرارہم۔[15]

ہندوستان آنے سے قبل بعض مشایخ سے اکتساب فیض

حضرت عبد اللہ شطار نے دیگر صوفیا سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ حضرت غوثی شطاری مانڈوی، حضرت عبداللہ شطار کے رسالہ غیبیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> [حضرت عبداللہ شطار نے] لکھا ہے کہ نفی و اثبات کے ذکر کی تلقین بہت سے ہادی اور مقبول اصحاب سے مجھ کو پہونچی ہے۔ میں جن ایام میں بخارا میں تھا، اُس وقت میں نے سنا تھا کہ شیخ مظفر کتلانی خلوتی جو نیشاپور میں ہیں صوفی کو تین روز کی خلوت میں خدا تک پہونچا دیتے ہیں۔ فوراً مین شیخ مظفر کی خدمت میں دوڑا گیا، جس قدر کانوں سے سنا تھا اس سے ہزار حصہ زیادہ آنکھوں سے

---

[15] غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۲۔

دیکھا۔

ایک عرصہ تک شیخ مظفر کی ملازمت کر کے نفی و اثبات کا ذکر اور اس کا تصور یاد کر لیا۔ یہ طریقہ شیخ مظفر کو شیخ ابراہیم عشق آبادی سے، اِن کو سید نظام الدین حسین سے، ان کو شیخ محمد خلوتی سے، اور ان کو شیخ نجم الدین کبری سے حاصل ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں خراسان اور عراق کی سیاحی کرتے ہوئے آزربائیجان کے ملک میں پہونچا۔ یہاں پر سید علی موحد [یعنی: میر سید علی ہمدانی] کی ملازمت حاصل کی، سید علی موحد کو شریعت طریقت اور حقیقت میں زیور کمالات سے آراستہ پایا اور ان کی صحبت سے مجھ [حضرت عبد اللہ شطار] کو بہت فائدہ پہونچا۔ سید علی موحد کو شیخ زین الدین خوافی سے اجازت تھی جو چار واسطہ سے شیخ الشیوخ سہروردی کو پہونچتے ہیں۔[16]

ہندوستان کے مشہور محقق، ڈاکٹر سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی صاحب لکھتے ہیں:

وہ [عبداللہ شطار] لمبی سیاحت کے بعد ہندوستان پہنچے تھے اور اس دوران انہوں نے ایک سو تیرہ (۱۱۳) مشائخ کرام سے استفادہ کیا تھا، جن میں تین نام بہت اہم ہیں: ۱- حضرت شیخ حاجی محمد بن عارف فاریابی؛ ۲- حضرت شیخ مظفر کنکانی خلوتی نیشاپوری؛ ۳- حضرت موحد ربانی سید علی ہمدانی سہروردی۔[17]

ہندوستان میں آمد

حضرت عبداللہ شطار اپنے پیر و مرشد کے حکم سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ شیخ عبد الرحمٰن چشتی، حضرت عبداللہ شطار کے متعلق لکھتے ہیں: شیخ محمد عارف نے آپ کو خرقہ خلافت دے کر ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔[18]

ہندوستان میں حضرت عبداللہ شطار کس سن میں تشریف لائے اس کی صراحت بھی نہیں ملتی۔ لیکن پروفیسر سید اطہر عباس رضوی، طبقات شاہ جہانی از محمد صادق کشمیری ھمدانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

16 غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۲۔

17 سید شمیم الدین احمد منعمی، معدن الاسرار فی بیان خاندان مشرب شطار، تعارف، تجزیہ اور ترجمہ؛ سہ ماہی انوار مخدوم، شمارہ، ۶، ص: ۹۷۔

18 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، ص: ۱۲۲۲۔

پندرہویں صدی عیسوی میں جب وسطی ایشیا میں سلسلہ نقشبندیہ کا غلبہ ہونے لگا تو سلسلہ عشقیہ پردۂ خفا میں جانے لگا۔ لہذا تیموری سلطان ابوسعید (۸۵۵-۸۷۳ھ/۱۴۵۱-۱۴۶۹ء) کے انتقال کے بعد، شاہ عبداللہ، شیخ حسام الدین کے ہونہار فرزند، جو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے نسل سے تھے، نے اس علاقے کو چھوڑ کر ہندوستان ہجرت کرنا مناسب سمجھا۔[19]

پروفیسر سید اطہر عباس رضوی کے مطابق، حضرت عبد اللہ شطار ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء کے بعد ہندوستان تشریف لائے مگر تاریخی شواہد سے یہ بات بھی غلط نظر آتی ہے کیوں کہ حضرت عبد اللہ شطار کا مخدوم سید اشرف جہانگیر (م: ۸۳۲ھ/۱۴۲۹ء)، شیخ حسام الدین مانک پوری (م: ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء) اور سلطان ابراہیم شرقی (م: ۸۴۳ھ/۱۴۴۰ء) اور سلطان محمود شاہ خلجی اول (۸۳۹-۸۷۳ھ/۱۴۳۶-۱۴۶۹ء) سے ملاقات تاریخی کتب سے ثابت ہے۔ نیز آپ کا محاصرۂ چتوڑ (۸۴۶ھ/ ۱۴۴۲ء) پر وہاں موجود ہونا بھی کتب تواریخ میں لکھا ہے۔[20]

ہمارے نزدیک یہ بات زیادہ درست ہے کہ حضرت عبداللہ شطار، امیر کبیر حضرت میر سید علی ھمدانی کبروی کے وصال یعنی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء کے بعد، اور ۸۳۲ھ/۱۴۲۹ء سے بہت پہلے ہندوستان تشریف لا چکے تھے۔

ہندوستان میں اس زمانے میں ملتان، اُچ، لاہور، ہانسی، دہلی، ایرج اور احمد آباد مشہور و معروف صوفی مراکز تھے، مگر حضرت شاہ عبد اللہ شطار کا ان شہروں میں پہنچنا کتب تواریخ سے معلوم نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے کہاں کیسے آمد ہوئی؟ تاریخی کتب اس پر بھی خاموش نظر آتے ہیں۔

حضرت عبداللہ شطار کا جاہ و جلال

حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

شاہ [عبداللہ شطار] کے جسم پر سلطانی لباس اور ہمراہی صوفیوں کے جسم پر فوجی وردی ہوتی تھی۔

---

[19] سید اطہر عباس رضوی، *A History of Sufism in India*، منشی منوہر لعل پبلشرز، دہلی، ۲۰۱۲ء، جلد: ۲، ص: ۱۵۲۔

[20] سلطان محمود شاہ خلجی کے محاصرۂ چتوڑ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، اردو ترجمہ، مترجم: عبد الحیٔ خواجہ [مشفق خواجہ]، المیزان ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ؛ ذکر شاہان مالوہ و مندو، جلد: ۲؛ حصہ: ۴، ص: ۵۲۶-۵۲۷۔

اس شان کے ساتھ علم اٹھاتے تھے اور نقارہ بجاتے تھے، اسی طرح طمطراق کے ساتھ سیاحی کرتے تھے۔ اہل جہاں کا تماشا کر کے فیض پہونچاتے تھے اور فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ اثنائے راہ میں جس زمین اور مکان پر پہونچتے تھے اس سرزمین کے مشائخ کو پیغام بھیجتے تھے کہ ایک درویش اس خیال سے سیاحی اختیار کی ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو مقیم لوگوں کو بے مشقت فائدہ اس میں ہے کہ وہ گنج توحید مسافر سے حاصل کر لے۔ کیونکہ ایسی فرصت جس میں اسباب سعادت بھی بہم پہونچیں دشواری سے ہاتھ آتی ہے۔ [21]

حضرت عبداللہ شطار کے دعوت و تبلیغ کا انوکھا انداز

صاحب تذکرہ ''مرآۃ الاسرار''، شیخ عبدالرحمٰن چشتی، حضرت عبداللہ شطار کے متعلق لکھتے ہیں:

[آپ کے شیخ] نے آپ کو طبل اور عَلَم [نقارہ اور جھنڈا] بھی عطا فرمایا اور وصیت کی کہ جس جگہ جاؤ اعلان کر دو کہ جو شخص طالب حق ہے آئے تاکہ میں اسے عطا کر دوں اور مشائخ روزگار کی خدمت میں جا کر کہو کہ اگر آپ کے پاس کوئی چیز ہے تو مجھے عنایت کر دو ورنہ جو کچھ میرے پاس ہے حاضر ہے۔ [22]

شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی، حضرت عبداللہ شطار کے دعوت و تبلیغ کے انداز کے متعلق لکھتے ہیں:

مشہور ہے کہ وہ [عبداللہ شطار] لوگوں کو نقارہ بجا کر بلایا کرتے تھے کہ جو طلب گار ہے، وہ آجائے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ بتادوں۔ [23]

صاحب تذکرہ ''مرآۃ الاسرار''، شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں:

یہ دیکھ کر بہت طالبان حق اور بے شمار خلقت آپ کے گرد ہو گئی، آپ جس شہر میں جاتے تھے خیمے نصب کر کے اپنے شیخ کی وصیت کے مطابق ہر سلسلے کا سلوک اختیار کرتے تھے۔ [24]

---

21 غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دارالنفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۲-۱۶۳۔

22 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۲۲۔

23 شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، مترجمین: مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، اکبر بک سیلرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۷۲۔

24 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۲۲۔

مانک پور اور جون پور میں آمد

سب سے پہلے حضرت عبداللہ شطار کا ذکر مانک پور اور جون پور کے حوالے سے ملتا ہے۔اس زمانے میں مانک پور اور جون پور دو اہم علمی و روحانی مراکز تھے۔تاریخی کتب میں اس بات کی صراحت نہیں ملتی کہ آپ مانک پور پہلے پہونچے یا جون پور پہلے۔ بعض مورخین نے مانک پور میں آمد پہلے بتائی ہے اور بعض نے جون پور کو پہلا پڑاو بتایا ہے۔جب ہم جغرافیائی اعتبار سے اس کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی مغرب کی جانب سے مشرق کی طرف آتا ہے تو مانک پور، جون پور سے پہلے پڑتا ہے۔

مانک پور آمد کے حوالے سے، شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ شطار پہلے مانک پور گئے۔[25] صاحب ''تذکرہ مشائخ شیراز ہند–جونپور'' جناب میاں محمد سعید لکھتے ہیں کہ ایران کے سفر کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلے وہ [عبداللہ شطار] مانک پور وارد ہوئے۔[26]

جون پور آمد کے حولے سے، جناب قاضی معین الدین احمد اپنے پی ایچ ڈی مقالے میں رسالہ قاضن شطار (مخطوط، ص:۷) اور رسالہ ابراھیمی (مخطوط، ص:۱۷۷) اور معدن الاسرار (مخطوط:۳۷) کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ آپ پہلے جون پور پہنچے، اس کے بعد مانک پور تشریف لے گئے۔[27] جغرافیائی اعتبار سے مانک پور کے بعد جون پور پہنچنا زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسی ترتیب سے واقعات اور حالات درج کرتے ہیں۔

شاہ عبداللہ شطار مانک پور میں

مانک پور، اودھ کا مشہور و معروف شہر تھا، جو علم و فضل کے اعتبار سے اپنے زمانے میں مرکز تھا۔ حضرت شاہ عبداللہ شطار جس زمانے میں مانک پور پہنچے، وہاں علم و عرفان کے تاجور شیخ حسام الدین چشتی سراجی مانک پوری (م: ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء) اپنی مسند ارشاد پر جلوہ افروز تھے۔ شیخ حسام الدین مانک پوری، سلسلہ چشتیہ کے عظیم شیخ طریقت مخدوم بنگال نور قطب عالم پنڈوی (م:۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء) کے معروف مرید و خلیفہ تھے اور

---

[25] ماخذ سابق، ص: ۱۲۲۴۔

[26] میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیراز ہند جونپور، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص: ۴۵۵۔

[27] قاضی معین الدین احمد، *History of the Shattari Silsila*، ص: ۸-۷؛ حاشیہ - ص: ۱۰۔

اپنے زمانے کے مرجع المشائخ تھے۔ اسی مانک پور میں شیخ حسام الدین کے خلفا، حضرت راجی حامد شاہ اور حضرت شاہ سیدو (سائڈو) بھی رہا کرتے تھے، غالب گمان یہی ہے کہ حضرت عبداللہ شطار ان بزرگوں سے ملاقات کی نیت سے ہی مانک پور وارد ہوئے تھے۔ بہر حال شاہ عبداللہ شطار کی آمد کی خبر جب حضرت شیخ حسام الدین کو پہونچی، تب آپ اور آپ کے دونوں خلفا محفل سماع میں مشغول تھے اور عالم کیف و مستی سے مغمور تھے، یہاں تک کہ آپ حضرات نے اپنے کپڑے بھی قوال کو نذر کر دیے تھے۔[28] حضرت عبد الرحمٰن چشتی، نے اس واقعے کو تفصیل سے بیان فرمایا:

> جب رفتہ رفتہ آپ شہر مانک پور پہنچے تو حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری، راجی سید حامد اور شاہ سیدو (سائڈو)، تینوں بزرگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ حضرت شیخ حسام الدین نے کمال بردباری سے فرمایا کہ : شیخ عبداللہ مسافر ہیں اور میں مقیم ہوں، مناسب یہی ہے کہ میں ان کو ملنے کے لیے جاؤں! لیکن چوں کہ مجلس سماع میں تینوں بزرگوں نے اپنے کپڑے قوالوں کی دے دیے تھے اور پہننے کے لیے کچھ نہ تھا، ایک مرید نے اتفاقاً ایک ''چشت قبا'' پیش کی۔ اس کے تین حصے کر کے تینوں بزرگوں نے زیب تن کیا اور ''اذا تم فقر فھم اللہ'' [جب فقر تمام ہوتا ہے تو اللہ ہی اللہ ہے] کا لباس پہن کر روانہ ہوئے۔ شیخ حسام الدین ننگے سر تھے۔ ایک مرید پان کے پتے جمع کر کے کلاہ بنا لایا، آپ نے اسے زیب تن کیا اور راستے میں ایک پرانی رسی پڑی تھی، اس سے آپ نے کمر باندھ لی۔ یہ حالت دیکھ کر شاہ سیدو پر حال طاری ہو گیا اور یہ مصرع فی البدیہ کہا: از کفر می ترسم مگر تو الٰہی۔ ترجمہ: کفر سے ڈرتا ہوں مگر تو میرا خدا ہے۔ یہ سن کر راجی سید حامد نے، جو شیخ حسام الدین کے محبوب ترین اور عارف ترین خلیفہ تھے، فرمایا: میاں سیدو (سائڈو) ابھی ''مگر'' باقی ہے![29]

ان تین بزرگوں کے حضرت شاہ عبد اللہ شطار کے خیمے کے پاس پہنچے سے پہلے ہی حضرت عبد اللہ شطار نے اپنے کشف سے جان لیا تھا کہ یہ حضرات آرہے ہیں، اس موقعے پر حضرت عبداللہ شطار کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، وہ اس طرح ہے؛ شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں:

> جب شیخ عبداللہ شطار کو ان حضرات کے آنے کی خبر ہوئی تو خیمہ سے باہر نکل آئے، اور کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے کہ برادرم شیخ حسام الدین کی آتش فقر سے میرا خیمہ کہیں جل نہ جائے۔ ملاقات کے

---

[28] ماخذ سابق، ص:8-9۔

[29] شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۲۳۔

بعد سب بزرگ درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ عبداللہ نے اپنے طریقے کے مطابق درخواست کی کہ: مجھے کچھ عطا کیجئے کہ طالب ہوں، ورنہ جو کچھ میں نے اپنے مشائخ سے حاصل کیا ہے، حاضر ہے۔ مخدوم شیخ حسام الدین نے کمال استغنا، عجز و انکسار سے جواب دیا کہ: میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آپ کے سامنے ظاہر کر دوں اور جو کچھ میں نے اپنے مشائخ سے حاصل کیا، اس قدر ہے کہ اب تک اس کے فوائد سے مستفیض ہو رہا ہوں اور آپ سے مزید کوئی چیز حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ شیخ عبداللہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور آپ کی بلندی ہمت کی داد دے کر فرمایا کہ: الحمد للہ! ہندوستان میں، میں نے ایک ایسا عارف دیکھا ہے جس کی ہمت کونین سے بھی زیادہ بلند ہے۔[30]

جناب قاضی معین الدین احمد اپنے پی ایچ ڈی مقالے میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا:

راستے میں ایک مرید نے پانی کی ایک ٹوکری پیش کی جسے ان بزرگوں نے شیخ عبداللہ شطار کو تحفہ میں پیش کر دیئے۔ حسام نے اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب شیخ عبداللہ کو ان تین ولیوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آپ نے اپنے حجرے سے باہر آکر استقبال کیا اور [چاروں] حضرات ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تشریف فرما ہو گئے، اور مسائل تصوف پر تبادلۂ خیال کرنے بیٹھے۔ مگر شیخ عبداللہ شطار حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری کو متأثر نہ کر سکے۔[31]

شیخ عبداللہ شطار کی جون پور آمد اور سلطان ابراہیم شرقی

جونپور میں حضرت عبداللہ شطار کی آمد اور سلطان ابراہیم شرقی کا آپ کی شہرت و سطوت سن کر متأثر ہونا تاریخ کا اہم حصہ بنا، حضرت عبداللہ شطار کا انوکھا انداز دعوت و تبلیغ اور ان کے مریدین کا فوجی لباس بادشاہ سلطان ابراہیم شرقی کے لیے ضرور تشویش کا باعث بنا ہوگا، حضرت عبداللہ شطار سے جب سلطان ابراہیم شرقی کی ملاقات ہوئی تو سلطان نے آپ سے کرامت کا مطالبہ کیا، جس پر حضرت عبداللہ شطار نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

صاحب ''تذکرہ مشائخ شیر از ہند-جونپور'' میاں محمد سعید لکھتے ہیں:

---

[30] ماخذ سابق، ص: ۱۲۲۴-۱۲۲۳۔

[31] قاضی معین الدین احمد، *History of the Shattari Silsila*، ص: ۹۔

جب وہ [عبد اللہ شطار] جون پور پہنچے تو ان دونوں سلطنت شرقی میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا آفتاب اقتدار پوری طرح جگمگا رہا تھا۔ وہ علما و مشائخ کا دل سے گرویدہ تھا۔ آپ مزید لکھتے ہیں:

> سلطان ابراہیم شرقی کو جب حضرت عبد اللہ شطار کے شاہانہ لباس، طرز تبلیغ اور مریدوں کی فوجی پریڈ اور ڈھول ڈھمکوں کا علم ہوا تو اس سے اظہار تعجب کیا اور ان کی امارت و فضیلت کے بارے میں اسے کئی طرح کے شبہات لاحق ہوئے، چنانچہ ایک روز وہ بھی ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہو گیا۔[32]

سلطان ابراہیم شرقی جب حضرت عبد اللہ شطار کی مجلس وعظ میں پہنچے تو دونوں کے درمیان ایک دل چسپ مکالمہ ہوا۔ شیخ عبد الرحمٰن چشتی لکھتے ہیں: ''ایک دن سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جون پور نے شیخ عبد اللہ شطار کی خدمت میں عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ حق نمائی [اللہ دکھانے] کا دعوی کرتے ہیں۔ مجھ پر، آپ کیوں نہیں کچھ ظاہر کرتے؟'' شیخ نے جواب دیا کہ: ''حق تعالیٰ ہر شخص کو ایک کام کے لیے پیدا فرمایا ہے، تم سلطنت کے کام میں مشغول رہو؛ کیونکہ خلقت کا فائدہ اسی میں ہے''۔ بادشاہ نے فرمایا: ''اس مجلس میں بہت لوگ موجود ہیں کسی اور پر کرم کر دیجیے''۔ شیخ نے جواب دیا: ''اس کے لیے جوہر قابل شرط ہے''۔ بادشاہ نے کہا: ''کئی ہزار آدمی موجود ہیں، ایک میں بھی جوہر قابل نہیں ہے''۔ یہ سن کر شیخ پر حال طاری ہوا، چاروں طرف نظر دوڑائی ،ایک خوبصورت نوجوان بادشاہ کو پنکھا کر رہا تھا۔ آپ نے اس پر توجہ فرمائی تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے بعد اس نے ترک [یعنی ترک دنیا] اختیار کیا اور حضرت شیخ سے بیعت ہو کر حلقہ میں داخل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ اور اہل مجلس دنگ رہ گئے، لیکن چوں کہ محفل دوسرا رنگ اختیار کر چکی تھی، شیخ کو یہ بات پسند نہ آئی اور وہ مالوہ چلے گئے۔[33،34]

حضرت عبد اللہ شطار کے جون پوری خلفا

جون پور میں حضرت شیخ عبد الحفیظ جون پوری شطاری، حضرت عبد اللہ شطار کے مشہور و معروف خلیفہ ہوئے ہیں، جن کا ذکر اکثر کتب میں پایا جاتا ہے۔ شیخ عبد الحفیظ جون پوری شطاری کے علاوہ جون پور میں ایک اور عظیم

---

[32] میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیر از ہند جونپور، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص: ۴۵۷۔

[33] دیگر تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد شیخ عبد اللہ شطار بنگال گئے، جہاں آپ کی ملاقات حضرت قاضن علا بنگالی سے ہوئی اور پھر وہاں سے آپ مالوہ کی طرف گئے۔

[34] شیخ عبد الرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، ص: ۱۲۲۴۔

المرتبت خلیفہ ہوئے ہیں، دنیائے تصوف انھیں شیخ قطب الدین قلندر جون پوری کے نام سے جانتی ہے۔ ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

جون پور میں ہی شاہ عبد اللہ شطاری کے ایک اور خلیفہ ہوئے جن کا ذکر کم از کم شاہ صاحب کے خلیفہ کے حیثیت سے تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا ہے۔ یہ شخصیت تھی شیخ قطب الدین بینا دل جون پوری کی جن کا ذکر سلسلۂ شطاریہ کے شجرے میں شاہ عبد اللہ شطار کے خلیفہ و مجاز کی حیثیت سے ہوا ہے۔[35]

جون پور کو خیر آباد کہنے کی وجوہات

بقول صاحب "تذکرہ مشائخ شیر از ہند-جونپور"، جناب میاں محمد سعید:

دراصل سلطان ابراہیم شاہ شرقی ان (عبد اللہ شطاری) کے ایسے طرز تبلیغ سے خفا تھے۔ چنانچہ عبد اللہ شطاری اس سے ناخوش ہو کر جون پور سے ہجرت کر کے مالوہ کی طرف چلے گئے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے ان سے ناراض ہونے اور ان کے جون پور سے ہجرت کر جانے کی تفصیلات ہمیں ہم عصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ سلطان ابراہیم کو ان کے شاہانہ لباس اور ان کے مریدوں کے فوجی لباس سے شک گزرا ہو گا اور وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ ان کے دارالسلطنت میں فوجی طرز کا کوئی ایسا گروہ آباد ہو جائے جس سے کسی وقت بھی تخت و سلطنت کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔[36]

ہمارے نزدیک یہ قیاس درست نہیں ہے، اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

۱- حضرت عبد اللہ شطار جس زمانے میں جون پور آئے تھے، وہ سلسلہ شطاریہ کا ابتدائی دور تھا، ان کے مریدوں کی تعداد کسی اعتبار سے اتنی نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک سلطنت کو کسی طرح نقصان پہنچا سکے۔ سلطان ابراہیم شرقی ایک طاقت ور بادشاہ تھے، ان کی فوج اپنے زمانے کی قوی ترین اسلامی فوجوں میں شمار ہوتی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عبد اللہ شطار کا محدود حلقۂ ارادت کسی طرح بادشاہ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔

۲- سلطان ابراہیم شرقی اولیا اللہ اور علمائے دین کے گرویدہ تھے، علما و مشائخ سے استفادہ اور ان کی مجالس میں

---

[35] فضیل احمد قادری، تاریخ مشرب شطار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص:۴۲۔

[36] میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیر از ہند جونپور، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص:۴۵۸۔

حصہ لینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایسے سلطان سے توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ حضرت عبداللہ شطاری جیسے صاحب ولایت شیخ طریقت سے ناراض ہو کر انہیں جون پور چھوڑنے پر مجبور کردے۔

ہمارے نزدیک حضرت عبداللہ شطار نے از خود جون پور کو الوداع کہا تھا، انہیں جون پور کا ماحول سلسلہ شطاریہ کی نشو نما کے لیے ساز گار محسوس نہ ہوا تھا۔ جون پور سے ہٹ کر کسی دوسرے شہر کو اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنانے کی حکمت یہ تھی کہ جس زمانے میں حضرت عبداللہ شطار جون پور پہنچے تھے، اس زمانے میں وہاں متعدد مشایخ سرگرم عمل تھے اور مختلف سلاسل کی خانقاہیں موجود تھیں۔ ان سلاسل کا اثر ورسوخ نیز حلقے کافی وسیع تھے، عوام کا رجحان بھی ان قدیم اور معتبر سلاسل کی طرف زیادہ تھا۔ حضرت عبداللہ شطار کو شاید ایسا محسوس ہوا ہو کہ سلسلہ شطاریہ کی نشر واشاعت کے لیے کسی اور مرکزی شہر کو مرکز دعوت و تبلیغ بنانا زیادہ بہتر ہوگا۔ اسی وجہ سے حضرت عبداللہ شطار جون پور کے علاوہ کسی اور مقام کی طرف جانا بہتر سمجھا۔

جناب قاضی معین الدین احمد لکھتے ہیں:

> جون پور سے حضرت عبداللہ شطار سحور پور موضوع اکبرپور، فیض آباد پہنچے جہاں ایک مشہور قلندری بزرگ شیخ داود آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے اور پھر وہاں سے مانک پور گئے۔[37]

حضرت عبداللہ شطار جون پور سے بہار و بنگال کی طرف اپنی توجہ کی، اور وہاں کا دورہ کیا، مگر وہاں بھی آپ کو ماحول اپنے لیے ساز گار نظر نہیں آیا، پھر آپ بہار سے مالوہ کی طرف تشریف لے گئے جہاں آپ کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا، چتوڑ کے محاصرے کے دوران آپ کی ذات سے کرامت کا ظہور ہوا اور آپ کے دعاوں کے اثر سے قلعہ فتح ہو گیا، اس کے نتیجے میں مالوہ کا بادشاہ بھی آپ کا بڑا معتقد ہو گیا، اور آپ نے شہر مانڈو، علاقۂ مالوہ کو اپنے وجود سے برکت پہنچائی۔

حضرت عبداللہ شطاری کا بہار و بنگال کا دورہ

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جون پور سے شیخ عبداللہ شطار بہار گئے، قدیم تاریخی شہر منیر اور اس کے اطراف مضافات کے آس پاس آپ کی ملاقات حضرت قاضن علا بنگالی سے ہوئی۔ اس زمانے میں بہار و بنگال میں حضرت علاء قاضن منیری کے علم و فضل کا کافی شہرہ تھا۔ عادت کے مطابق حضرت عبداللہ شطار نے علاء قاضن کو دعوت بیعت دی، حضرت علاء قاضن نے جواباً ارشاد فرمایا: ''خراسان سے ایسے بہروپیے اکثر آیا کرتے ہیں''۔

---

[37] قاضی معین الدین احمد، *History of the Shattari Silsila*، ص:۸۔

جناب قاضی معین الدین احمد، حضرت عبداللہ شطار کے الفاظ کچھ اس طرح بتاتے ہیں: "شاہ عبد اللہ شطاری اس ریمارک پر ناراض ضرور ہوئے اور فرمایا: کامل پیر کی تلاش اسے میرے در پر ہی لے آئے گی"۔[38]

جناب قاضی معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ مصنف رسالہ گزار ابراہیمی نے غلط لکھا کہ: شیخ عبداللہ نے شیخ قاضن کو جون پور میں ملاقات کی۔[39]

حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

> جب آپ [حضرت عبد اللہ شطار] بنگال میں پہونچے، تو حسب معمول یہی پیغام شیخ محمد عُلا کے پاس بھی بھیجا جو آج کے روز شیخ قاضن شطاری کے نام سے نام زد ہیں۔ شیخ محمد علا نے جواب دیا کہ ایسے فضول گو اشخاص خراسان اور پارس [فارس] سے بہت آتے ہیں۔ پیغام دینے والے شاہ صاحب نے جواب سن کر فرمایا: شیخ محمد عُلا کے کمالات کا ظہور مجھ ہی فضول گو کی تلقین پر منحصر ہے۔ ان ایام میں سلطان غیاث الدین خلجی نے چتور [چتوڑ] کے قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔[40]

چتور/چتوڑ-ایک تعارف

چتور/چتوڑ علاقۂ راجپوتانہ کا ایک عظیم شہر ہے۔ اس شہر کا تاریخی قلعہ خطرناک تھا جس کا فتح کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اس قلعے کو فتح کرنے کی پہلی کوشش سلطان دہلی علاء الدین خلجی نے ۷۰۲ھ/۱۳۰۳ء میں کی تھی، اور کامیاب رہا۔ ملک محمد جائسی کی تاریخی کہانی- پدماوت- اسی محاصرے اور جنگ کی داستان بیان کرتی ہے۔ یہ قلعہ مسلمان حکمرانوں اور راجپوت راجاؤں کے درمیان ہمیشہ جنگ کی وجہ رہا، مسلمان اسے فتح کرتے، مگر پھر کسی نہ کسی طریقے سے یہ قلعہ راجپوتوں کے زیر اقتدار چلا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ شطار چتور ومالوہ میں

شیخ عبد اللہ شطار چتوڑ، ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں پہونچے تو سلطان مالوہ محمود خلجی اور اس کے بیٹے غیاث الدین

---

[38] ماخذ سابق، ص: ۱۰۔

[39] ماخذ سابق، ص: ۱۰۔

[40] غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۳۔

خلجی کو راجپوت راجاوں کے خلاف چتوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کرتے ہوئے پایا۔ ایک ولی کامل کی آمد کو سلطان نے ایک اچھا شگن سمجھا اور شیخ عبداللہ شطار کا والہانہ استقبال کیا اور اتفاق سے سلطان کو اس مہم میں بھی کامیابی حاصل ہوگئی جس کی بدولت سلطان کے دل میں شیخ کی عظمت مزید بڑھ گئی۔[41]

صاحب تذکرہ ''گلزار ابرار'' حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

آپ نے بنگال سے معاودت فرمائی۔ تو اسی راہ سے آکر قلعہ مذکور [قلعہ چتوڑ] کے نیچے آٹھہرے، سلطان نے حاضر ہو کر آستانہ بوسی کی۔ اسی مورچہ سے جو آپ کی خیمہ گاہ کے برابر میں تھا، آپ کی توجہ کی بدولت اتنے تھوڑے روز کے اندر قلعہ فتح ہوگیا کہ گمان میں بھی نہیں آسکتا ہے۔ سلطان نے نہایت تعظیم اور اعزاز کے ساتھ آپ کو اپنی روانگی سے پیشتر دارالاسلام منڈو [مانڈو] میں روانہ کیا۔[42]

شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں: مالوہ کے بادشاہ نے آپ کو بہت عزت و تکریم کے ساتھ منڈو میں ٹھہرایا، چنانچہ کئی برس وہاں قیام پذیر ہو کر ہدایت خلق میں مشغول رہے۔[43]

میاں محمد سعید لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ شطاری جب چتوڑ پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات سلطان غیاث الدین خلجی [۱۴۶۹-۱۵۰۱ء] والئ مالوہ سے ہوئی۔ وہ اس وقت اس قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، مگر انھوں نے ان کا استقبال بڑے شاندار طریقے سے کیا اور قلعہ کی فتح کے لیے دعا کی خواہش کی، چنانچہ ان کی دعا سے قلعہ فتح ہوگیا، بلکہ قلعہ کی فتح تک وہ خود بھی وہیں رہے۔ سلطان غیاث الدین خلجی ان سے بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے وہاں ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور پھر انھیں اپنی افواج فاتح سے پہلے ہی دارالسلطنت مانڈو بھیجوادیا، وہاں بھی ان کا استقبال بڑی شان و شوکت سے کیا گیا۔ اس کے بعد پھر وہ مستقل طور پر مانڈو میں آباد ہوگئے۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے وہاں ان کو ہر طرح کی

---

41 سلطان محمود شاہ خلجی کے محاصرۂ چتوڑ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، مترجم: عبدالحئی خواجہ [مشفق خواجہ]، المیزان ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۸ء، جلد: ۲، ص: ۵۲۶-۵۲۷۔

42 غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دارالنفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۳۔

43 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۲۴-۱۲۲۵۔

سہولتیں بہم پہنچائیں اور تادم حیات ان دونوں میں بڑے عمدہ تعلقات قائم رہے۔ شاہ عبد اللہ شطاری نے اپنی تصنیف ''لطائف غیبیہ'' بھی انھیں کے نام معنون کی۔ مانڈو میں انھیں اپنے تبلیغی مقاصد میں بھی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔[44]

شیخ عبداللہ شطار شرقی سلاطین کو زیادہ متأثر نہ کر پائے تھے۔ حضرت غوثی شطاری مانڈوی کے مطابق مانڈو میں، حضرت عبد اللہ شطار، سلطان غیاث الدین خلجی کی عقیدت و محبت سے اتنے متأثر ہوئے کہ اپنی کتاب ''لطائف غیبیہ'' کاانتساب بھی ان کی طرف کر دیا۔

شیخ قاضن کے بیعت ہونے کاواقعہ

شیخ قاضن شطاری جب مزار مخدوم جہاں حضرت شرف الدین احمد بن یحیٰ فردوسی منیری قدس سرہ پر معتکف و مراقب تھے، توانہیں غیبی طور پر اپنے بزرگوں کا اشارہ ہوا کہ وہ حضرت عبد اللہ شطار سے رجوع کریں اور منازل سلوک طے کریں۔

شیخ قاضن شطاری کے بیعت ہونے کا تفصیلی واقعہ کچھ اس طرح ہے، ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

مانڈو میں شاہ عبد اللہ شطاری کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ تفصیل سے شیخ قاضن نے اپنے ملفوظات میں بیان کیاہے: ''اپنے دوستوں، احمد محمد، عبدالحکیم اور شیخ سعد اللہ کے ساتھ بہار سے مانڈو کے لئے روانہ ہوئے۔ تین دنوں تک شیخ نے کوئی التفات ظاہر نہیں کیا۔ کئی مہینے گزر گئے اور مانڈو کی گرمی سے وہ [شیخ قاضن] پریشان ہوتے رہے۔ بالآخر ایک روز شیخ ملتفت ہوئے اور طے کے روزے کا حکم دیا۔ اسی درمیان ایک قدرتی امتحان ہو گیا۔ میرے ہم سفر عبدالحکیم سخت بیمار ہو گئے اور حالت ایسی بگڑی کہ امید زیست جاتی رہی۔ ان کی دیکھ ریکھ اور شیخ کی دعاؤں سے بیمار کی حالت میں افاقہ ہوا اور دوست موصوف نے اصرار کیا کہ مجھے وطن پہنچاؤ۔ اب میں دو جذبوں کے درمیان گھرا تھا۔ ایک طرف بیمار دوست اور دوسری طرف شیخ سے استفادے کی نیت۔ بہر حال شیخ کی اجازت سے بیمار کو لے کر وطن کی طرف روانہ ہوا۔ سفر کے چوتھے دن دوست نے شیخ کی خدمت میں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ واپسی پر شیخ شفقت و ملائمت سے ملے۔ شب جمعہ،

---

[44] میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیراز ہند جونپور، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص: ۴۵۸-۴۵۹۔

چہارم ذی الحجہ ۸۸۱ھ [مطابق مارچ ۱۴۷۶ء] میں شیخ نے بیعت سے سرفراز فرمایا: اور مشرب شطار خاص الخاص کی تعلیم و تلقین اور اجازت بھی مرحمت فرمائی اور وطن واپس روانہ کیا۔[45]

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

> شیخ قاضن مخدوم شرف الدین احمد کے مزار پر اکثر مراقب ہوتے تھے۔ اور وہیں سے شاہ عبد اللہ شطار کی خدمت میں جانے کی بشارت [حکم] ملتی تھی۔ [معدن الاسرار، ص: ۲۳۹]۔ چونکہ یہ بیان خود شیخ کا ہے لہٰذا اس سے غوثی شطاری کے اس بیان کی کہ شاہ عبد اللہ کے نام۔۔۔ اگر کوئی کلمۂ توحید کے معنی اس سے بہتر جانتا ہو تو مسافر کو تعلیم دے اور اگر ایسا نہ ہو تو۔۔۔ گنج توحید۔۔۔ [اس] پر شیخ قاضن نے انھیں فضول گو کہا تھا پُر زور تردید ہوتی ہے۔[46]

ہمارے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی یہ توجیہ درست نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ شاہ عبد اللہ شطار کا دعویٰ اور حضرت قاضن شطاری کا جواب، ان کی پہلی ملاقات کا ہے، جب شاہ عبد اللہ شطار پہلی بار بہار و بنگال کے دورے پر جون پور سے تشریف لے گئے تھے۔ اور علاء قاضن شطاری تب شاہ عبد اللہ شطاری کے مراتب عالیہ سے کما حقہ آشنا نہیں ہوئے تھے۔ حضرت شاہ عبد اللہ جب واپس ہوئے اور مانڈو پہنچے، حضرت علاء قاضن کو مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری سے حکم ہوا کہ وہ شاہ عبد اللہ شطار سے رجوع کریں۔ ان واقعات اور حکایات کے درمیان اس سے بہتر کیا تطبیق ہو سکتی ہے؟ ایک واقعہ کی روشنی میں دوسرے واقعہ کو تب تک مسترد نہ کرنا چاہئے جب تک کہ تطبیق کی کوئی صورت نظر نہ آئے، ورنہ اس طرح تو ہمیں تصوف کے بے شمار کتب میں واقعات و حکایات میں اختلاف بکھرے ہوئے ملیں گے اور اگر اس طرح انکار کا اصول بنا لیا جائے تو شاید ہی کوئی واقعہ یا حکایت مستند قرار دی جائے گی۔

کتب تاریخ میں یہ بات واضح طور پر درج ہے کہ جب شاہ عبد اللہ شطار بہار و بنگال پہنچے تب حضرت قاضن شطاری ان کے حلقہ ارادت میں نہیں آئے تھے، بیعت و ارادت کا واقعہ تصنیف حضرت قاضن شطاری- ''معدن الاسرار'' میں بھی تفصیل سے درج ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حضرت قاضن شطاری مرید

---

45 فضیل احمد قادری، تاریخ مشرب شطار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص: ۴۷۔

46 ماخذ سابق، ص: ۴۶۔

ہونے کے لیے ماڈو تشریف لے گئے تھے، جب کہ ڈاکٹر صاحب نے جس واقعہ کاانکار کرنے کی کوشش کی ہے وہ بہار وبنگال کے دورے میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔

حضرت قاضن شطاری مرید اور مجاز ہونے کے بعد واپس بہار تشریف لائے۔ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

شاہ عبداللہ شطار سے اجازت وخلافت ملنے کے بعد اپنی زندگی کے بقیہ بیس سال شیخ قاضن شطاری نے رشد وہدایت اور ترویج واشاعت مشرب شطار کے لیے وقف کر دیے اور شمالی بہار میں ترہت [ترہٹ] کو اپنی تبلیغی کاوشوں کا مرکز بنایا۔[47]

حضرت عبداللہ شطار کا مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی سے مستفید و متفیض ہونا

حضرت شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں:

لطائف اشرفی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب میر سید اشرف جہانگیر سیر کرتے ہوئے مالوہ تشریف لے گئے تو شیخ عبداللہ شطاری نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض حاصل کیا۔[48]

حضرت عبداللہ شطار کا کشف

شیخ عبداللہ شطار کے کشف کے بارے میں، شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

جب مجلس میں بیٹھتے تو جوانب اربعہ (چاروں جانب) کی طرف خوب دیکھ کر فرمایا کرتے کہ یہاں کوئی سیاہ دل اور شک وشبہ کرنے والے لوگ نہ بیٹھیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی باتیں آزادی کے ساتھ بتائی جاسکیں۔[49]

حضرت شیخ عبداللہ شطار کا لوگوں کو پرکھنے کا انداز نہایت نرالا تھا۔ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

---

[47] ماخذ سابق، ص:۴۷۔

[48] شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ص:۱۲۲۵۔

[49] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، مترجمین: مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، اکبر بک سیلرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۳۷۲۔

مشہور ہے کہ جب کوئی راہ حق کا متلاشی آپ کے پاس آتا تو اس کی عقل اور حواس کا امتحان لینے کے لیے ایک (خاص قسم کی) روٹی، دوسری کھانے کی روٹیوں کے ساتھ بھیجتے اور ایک آدمی کو مقرر کر دیتے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس نے وہ روٹی بھی دوسری روٹیوں کے ساتھ کھالی ہے یا وہ ایک روٹی چھوڑ دی ہے۔ اگر وہ آنے والا تمام روٹیاں کھالیتا تو اسے اس کی عقل مندی اور دانائی پر محمول کرتے اور اس کو باطنی ذکر واذکار کے لیے کوئی چیز عنایت فرمادیا کرتے، اور اگر وہ ایک روٹی چھوڑ دیتا تو اس کو اس کے حالات غیر صحیحہ اور اس آدمی کی بے عقلی پر محمول کرتے ہوئے اس کو ظاہری حالت کے لیے کوئی وظیفہ یاد عا بتادیا کرتے تھے۔[50]

شاہ عبداللہ شطار کے زمانہ تبلیغ کے متعلق، میاں محمد سعید لکھتے ہیں:

شاہ عبداللہ بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ وہ اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لیے جب اس ملک میں آئے تو اس وقت سلطنت دہلی کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا اور سارا ملک مذہبی بحران سے گزر رہا تھا؛ لہٰذا ایسے حالات میں ایک نئے سلسلے کی داغ بیل ڈالنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ خاص طور پر جب کہ سہروردیہ اور چشتیہ جیسے عظیم سلسلوں کی عمارت تک ان حالات میں مسمار ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں کسی بھی نئے سلسلے کی ترویج و ترقی کے لیے شاہ عبداللہ جیسے تجربہ کار اور عظیم المرتبت بزرگ کی ضرورت تھی، چنانچہ ان کو اپنے مقصد میں بہت کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے حلقہ ارادت میں اس دور کے لاتعداد علما، صوفیا بھی شامل ہو گئے جنھوں نے اس سلسلے کی نشو و نما اور ترقی میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔[51]

حضرت عبداللہ شطار کے خلفا

حضرت شاہ عبداللہ شطار کے ہندوستان میں تین نامور اور عظیم خلفا ہوئے ہیں: ۱- شیخ حافظ شطاری جون پوری؛ ۲- شیخ قطب الدین قلندر جون پوری؛ ۳- شیخ ابو محمد قاضن علا شطاری بہاری۔

تصنیف و تالیف

---

[50] ماخذ سابق، ص: ۳۷۳-۳۷۲۔

[51] میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیراز ہند جونپور، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، طبع دوم: ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ص: ۴۵۹-۴۶۰۔

حضرت عبداللہ شطار صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ آپ کی مشہور زمانہ کتاب- رسالہ ''لطائف غیبیہ'' ہے۔ مگر افسوس، ہنوز یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے، اس کے مختلف قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، کاش کوئی مرد مجاہد اس رسالے پر کام کرے اور اس فارسی رسالے کو تحقیق و ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر لائے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ یہ خود بانی سلسلہ کی لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات، تعلیم و تربیت، حصول علم سلوک کے ساتھ ساتھ سلسلہ شطاریہ کی تعلیمات اور نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت عبداللہ شطار کے اس کتاب کے مختلف اقتباسات قدیم تذکراتی کتب میں ملتے ہیں، ہم انہیں یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

> ایک رسالہ ''لطائف غیبیہ'' آپ کی تصنیفات سے ہے۔ سلطان غیاث الدین خلجی شاہ مالوہ کے نام ترتیب دیا تھا۔ اس رسالہ میں آپ لکھتے ہیں: ''توحید کے اسرار، وجد کے اطوار، الٰہی حقائق اور طریقت و حقیقت کے دقیقے جو صفحہ خاطر کی لوح پر محفوظ تھے۔ یہ یا تو ''وعلمناہ من لدنا علما'' کی رہنمائی کی بدولت مبدء فیاض سے بے واسطہ پہونچے تھے یا '' فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون '' کے حکم کے بموجب مشائخ طریقت سے بالواسطہ معلوم ہوئے تھے۔ اِن سب باتوں کو قلم کے ذریعہ سے اوراق میں ثبت کیا ہے تا کہ اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں کو فیض پہونچے۔ اور رحمۃ اللعالمین ہونے کا اطلاق خلافۃً میرے اوپر بھی صادق آئے۔ نیز لکھا ہے کہ نفی و اثبات کے ذکر کی تلقین بہت سے ہادی اور مقبول اصحاب سے مجھ کو پہونچی ہے۔ میں جن ایام میں بخارا میں تھا اُس وقت میں نے سنا تھا کہ شیخ مظفر کتانی خلوتی جو نیشاپور میں ہیں صوفی کو تین روز کی خلوت میں خدا تک پہونچا دیتے ہیں۔ فوراً میں شیخ مظفر کی خدمت میں دوڑا گیا جس قدر کانوں سے سنا تھا اس سے ہزار حصہ زیادہ آنکھوں سے دیکھا۔[52]

شیخ محقق حضرت عبدالحق محدث دہلوی آپ کی مشہور تصنیف کے متعلق فرماتے ہیں:

> آپ اپنے شہرۂ آفاق رسالہ شطاریہ میں سلسلہ شطاریہ کے اذکار و اوراد اور مراقبے لکھے ہیں۔ اور اس رسالے کی ابتداء میں شیخ شہاب الدین (سہروردی) تک اپنا سلسلہ (نسب) بھی درج فرمایا ہے اور

---

[52] غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دار النفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۲۔

شیخ نجم الدین کبریٰ تک پانچ واسطوں سے آپ کا سلسلہ ارادت پہنچتا ہے۔[53]

شرح لطائف غیبیہ

رسالہ ''لطائف غیبیہ'' کی افادیت و عظمت کے پیش نظر اس کی شرح بھی لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر فضیل احمد قادری لکھتے ہیں:

......مشائخ شطار میں امام الدین محمد عارف العثمانی المعروف بہ شیخ عبد النبی شطاری ایک اہم بزرگ گزرے ہیں۔ یہ سلسلہ شطاریہ کے ایک اہم علمی ستون ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کی پچاس سے زائد تصنیفات کا ذکر ہے جن میں مکمل ایک درجن کتابیں صرف تصوف پر ہیں۔ آپ کی سب سے زیادہ معروف کتاب عربی زبان میں شاہ عبد اللہ شطار کی تصنیف ''لطائف غیبیہ'' کی شرح ''جواہر الاسرار فی شرح اللطایف الغیبیۃ'' ہے۔[54]

مشہور محقق، ڈاکٹر سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی صاحب لکھتے ہیں:

حضرت شیخ حافظ جون پوری نے بھی ''ورثۃ الحق'' کے نام سے شطاریہ سلسلہ کے بعض مصطلحات کی شرح حضرت شیخ عبد اللہ شطار کے ملفوظات کی شکل میں جمع فرمایا تھا لیکن یہ کتابیں اب نایاب ہیں۔[55]

حضرت عبد اللہ شطار کا وصال پر ملال اور آخری آرام گاہ

حضرت عبد اللہ شطار کا وصال ''مانڈو''، علاقۂ مالوہ میں ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں ہوا۔ حضرت غوثی شطاری مانڈوی لکھتے ہیں:

آپ ہجری سن آٹھ سو نوے (۸۹۰ھ) میں ترک تعین کر کے خلوت خانہ لا تعین کی طرف کوچ

---

[53] شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، مترجمین: مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، اکبر بک سیلرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۷۲۔

[54] فضیل احمد قادری، تاریخ مشرب شطار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء، ص: ۸۶۔

[55] سید شمیم الدین احمد منعمی، معدن الاسرار فی بیان خاندان مشرب شطار، تعارف، تجزیہ اور ترجمہ؛ سہ ماہی انوار مخدوم، شمارہ، ۶، ص: ۹۸۔

فرما گئے۔ آپ کی خواب گاہ منڈہ (مانڈہ) میں ہے سلاطین خلجی کے مقبرہ کی جنوبی سمت میں۔ [56]
شیخ عبدالرحمٰن چشتی لکھتے ہیں:

حضرت شیخ عبداللہ کا مزار مندو [مانڈو] میں واقع ہے، آپ کے سلسلے کے ایک بزرگ پیر میر ٹھی ہیں، ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ کے ہمراہ مندو گئے اور مزار پر مقبرہ تیار کروایا۔ چنانچہ وہ عمارت اب تک موجود ہے۔ شیخ عبداللہ شطاری کی کرامات و کمالات بیان سے باہر ہیں۔ تربیت مریدین میں آپ بڑے ماہر تھے۔ [57]

مطبوعات دارالمصنفین

سفر نامے

سفر نامہ روم و مصر و شام

از علامہ شبلی نعمانی

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے جو سفر کیا تھا اس کے حالات و واقعات، یہ سفر نامہ اردو میں ممالک اسلامیہ کا پہلا سفر نامہ ہے جس میں ترکی، مصر اور شام کے علمی، تعلیمی، تمدنی حالات کی تصویریں کھینچی ہیں۔
صفحات ۲۳۶/قیمت ۲۰۰ روپے

سفر حجاز

از مولانا عبدالماجد دریابادی

اس سفر نامہ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے سفر حجاز کے دلچسپ، چشم دید حالات لکھے ہیں اور حج و زیارت کے متعلق تمام فقہی معلومات وہدایات کو جمع کر دیا ہے۔
صفحات ۳۵۴/قیمت ۳۵۰ روپے

56 غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد جیوری، نفیس منزل/دارالنفائس، لاہور، ۱۴۲۷ھ، ص: ۱۶۲۔
57 شیخ عبدالرحمٰن چشتی، مرآۃ الاسرار، مترجم: واحد بخش سیال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء؛ ص: ۱۲۲۵۔

عباسی عہد میں غیر مسلمین

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد عرفان احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

irfan@manuu.edu.in

اسلام امن و آشتی کا دین ہے، اللہ تعالی کی مقدس کتاب قرآن مجید اور پیغمبر خدا حضرت محمد ﷺ کے ارشادات میں جابجا غیر مسلموں سے حسن سلوک اور اعلی درجے کی رواداری کا حکم ہے۔ صلح حدیبیہ، میثاق مدینہ اور فتح مکہ پر غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، حسن سلوک اور اعلی اخلاقی اقدار کے مظاہرے کی بنیاد پر قائم شدہ بہترین سیاسی، معاشرتی اور معاشی تعلقات کو تاریخ انسانیت میں نمایاں مقام حاصل ہے، اس انسانیت نواز روایت کو آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین اور بعد کے خلفاء نے بھی فروغ دیا۔

عباسی عہد چونکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے عروج کا دور ہے، اس میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، قاہرہ، سمرقند اور بخارا وغیرہ شہر اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہے۔ عباسی حکومت کے زیر حکمرانی مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، یہودی، مجوسی، صابئ، ہندو، بدھ، اور جین مذہب کے پیروکار آباد تھے، ان تمام مذاہب کے متبعین کو ہر قسم کے شہری، شخصی، اجتماعی اور مذہبی حقوق حاصل تھے، اس تکثیری معاشرے میں انہیں اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہونے اور اپنے مذہب پر چلنے کی مکمل آزادی تھی۔ انہیں اپنے مقدمات کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق کرنے کا حق بھی حاصل تھا گویا کہ ان شہروں میں آبادی کی کثرت کے باوجود بلاامتیاز رنگ و نسل اور مذہب و عقیدہ تمام لوگوں کے حقوق محفوظ تھے۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور اعلی اخلاقی اقدار کے مظاہرے کے ساتھ ان کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی میں عباسی حکمرانوں کا کردار نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد میں غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک مستقل محکمہ کا ذکر ملتا ہے جس کے افسر کو ''کاتب الجہباز'' کہا جاتا

ہے۔ غیر مسلموں کے حقوق کے تعلق سے قاضی ابویوسف اپنی کتاب ''کتاب الخراج'' میں خلیفہ ہارون رشید کو نصیحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں[58]۔

وقد ينبغي يا أمير المؤمنين - أيدك الله - أن تتقدم في الرفق بأهل ذمة نبيك وابن عمك محمد ﷺ والتفقد لهم حتى لا يظلموا أو لايؤذوا ولايكلفوا فوق طاقتهم، ولايؤخذ شيء من أموالهم الا بحق يجب عليهم. فقد روي عن رسول الله ﷺ أنه قال: "من ظلم معاهداً أو كلفه فوق طاقته فأنا حجيجه". وكان فيما تكلم به عمر بن الخطاب رضي الله عنه عند وفاته: أوصى الخليفة من بعدي بذمة رسول الله ﷺ أن يوفي لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا فوق طاقتهم.[۵۹]

ترجمہ: امیر المومنین! اللہ آپ کی مدد کرے۔ ہونا یہ چاہئے کہ آپ مہربانی کرنے میں ان لوگوں کی طرف پیش قدمی فرمائیں۔ جن کی ذمہ داری آپ کے پیغمبر اور آپ کے چچا کے بیٹے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لی ہے، آپ کو ان کی خبر گیری میں سرگرمی دکھانا چاہیے تاکہ وہ ظلم سے محفوظ رہیں اور کوئی ان کو دکھ بھی نہ پہنچا سکے اور ان پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور ان کے مال سے واجبات سے زیادہ کچھ بھی وصول نہیں کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا۔ یا برداشت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالے گا، قیامت کے دن میں اس کے خلاف (اس معاہد کی جانب سے) وکالت کروں گا۔ (قاضی ابویوسف نے حضرت عمرؓ کی وصیت کا ذکر کرتے ہوئے ہارون رشید کو نصیحت کی کہ) حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل اپنے بعد آنے والے خلفاء کو وصیت کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ذمی رعایا کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے اسے پورا کیا جائے اور ان کا دفاع کیا جائے اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔

اس وصیت سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور عباسی خلفاء نے ان کے ساتھ معاشرت و معاملات میں مزید وسعت پیدا کی اور اسے قانونی شکل دے کر اس کے نفاذ کو یقینی بنایا اور ساتھ ہی اپنے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو عام کرنے کی غرض سے انہیں سماجی طور پر مناسب مقام عطا کیا۔ حکومتی و رفاہی امور کی قیادت ان کے سپرد کی تاکہ عالم انسانیت کو ان کی نفع بخش صلاحیتوں سے بھی فائدہ ملے۔ نتیجتاً غیر مسلم علماء و فضلاء اور ماہرین فن

---

58 ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظم مملکت، (مترجم، مولوی علیم اللہ صدیقی) دارالاشاعت کراچی۔ ۱۹۷۵ء ص ۲۴۴

59 قاضي أبويوسف، كتاب الخراج، دار المعرفة للطباعة والنشر، بيروت، ۱۹۷۹ء، ص ۴۲۱۔ ۵۲۱۔

نے اپنی قابل قدر خدمات کے ذریعے اپنا نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ذیل کے سطور میں عباسی دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حقوق اور عباسی خلفا کی اہل علم و فن کی قدر دانی اور غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

تاریخی حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تعلق سے مسلم حکمراں بہت ہی روادار اور فراخ دل تھے، سید امیر علی نے مامون رشید کے بارے میں لکھا ہے کہ مامون نے باقاعدہ ایک کونسل آف اسٹیٹ (مجلس مشاورت) قائم کی تھی۔ جس میں حکومت کے مختلف اقوام مسلمان، یہودی، عیسائی، صابئ، زرتشتی بطور ارکان شامل تھے۔ جس کی وجہ سے عباسی خلفا کے دور میں غیر مسلموں کو ہمیشہ مذہبی آزادی حاصل رہی۔ اس میں اگر کبھی کوئی تبدیلی ہوئی تو اس کا سبب مقامی گورنروں کا طرز عمل رہا۔[60]

مجلس مشاورت یا کونسل آف اسٹیٹ نے غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری میں اہم رول ادا کیا اور اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کے حقوق کی ترجمانی کی اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کی وکالت کرتے رہے جس کے نتیجے میں اس دور میں غیر مسلموں کو ہر طرح کی آزادی میسر ہوئی بلکہ علامہ شبلی نعمانی کے مطابق اس طرح کی آزادی جدید دور میں بھی کسی مہذب گورنمنٹ نے کسی دوسری قوم کو نہیں دی، چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> مامون کے عہد میں دوسری قوموں کو جو حقوق حاصل تھے، مہذب سے مہذب گورنمنٹ میں بھی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ یہود، مجوس، عیسائی، لامذہب اس کی وسیع حکومت میں نہایت آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ خاص دارالخلافہ بغداد میں بہت سے گرجے اور چرچ نئے تعمیر ہوئے موجود تھے۔ جن میں رات دن ناقوس کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ دربار میں ہر مذہب و ملت کے علماء و فضلاء حاضر رہتے تھے اور مامون ان کے ساتھ نہایت عزت و توقیر سے پیش آتا تھا۔
> 61

علامہ شبلی کی تائید مستشرق محقق پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ کی عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ عباسی عہد کے مجوسی کی آبادی اور ان کی عبادت گاہوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[60] سید امیر علی، تاریخ اسلام، آزاد بک ڈپو، امر تسر ص ۱۵۸

[61] علامہ شبلی نعمانی، المامون، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء ص ۱۵۸

دسویں صدی عیسوی میں یعنی اسلامی فتح کے تین سو سال بعد تک عراق، فارس، کرمان، سجستان، خراسان، جبال، آذر بائیجان اور اران، غرض کہ ایران کے تقریباً ہر صوبے میں آتش کدے پائے جاتے تھے۔ فارس کے صوبے میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شہر یا ضلع ہوگا جس میں مجوسی اور ان کے آتش کدہ موجود نہ ہوں۔ شہرستانی نے بھی، جس کا زمانہ تحریر بارہویں صدی عیسوی ہے، لکھا ہے کہ بغداد کے قرب وجوار میں اسفینیا کے مقام پر ایک آتش کدہ موجود تھا۔[62]

مامون رشید کے دور حکومت میں غیر مسلم عبادت گاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سید امیر علی نے لکھا ہے کہ ان کے دور میں آتش کدوں اور ہیکلوں کے علاوہ صرف کلیساؤں کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔[63]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عباسی حکومت کے زیر سایہ مجوسی اور عیسائی اقوام کی ایک بڑی تعداد زندگی بسر کرتی تھی اور اسلامی رواداری کا یہ عالم تھا کہ آتش کدوں میں کھلے طور پر پرستش ہوتی تھی۔ تمام ادیان و مذاہب اپنی تبلیغ و اشاعت میں آزاد تھے۔ ہندوستان کے حکماء و فلاسفہ اور اطباء اعلانیہ اپنے مذہب کا پروپیگنڈہ کرتے تھے۔[64] اس دور میں بامیان اور ملتان کے قدیم اور مشہور بت خانوں کے علاوہ دوسرے علاقوں کے بت خانے اپنے پجاریوں سے آباد رہا کرتے تھے۔ ان کے مذہبی رسوم میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ عباسی خلفاء اپنی وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیر مسلموں کے تہواروں میں خود شامل ہوتے اور خوشی کے مواقع پر تحفے اور انعام و اکرام سے بھی نوازتے جس کی وجہ سے تکثیری سماج میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم تھے۔ ممتاز مصری مؤرخ حسن ابراہیم حسن اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کسری خاندان کے شہنشاہ اور عباسی خلفا سال کے شروع میں جس شان و شوکت سے نوروز کا جشن منعقد کرتے تھے، اسی شان و شوکت سے سال کے اخیر میں مہرجان کا جشن منعقد کرتے تھے۔ مہرجان کو روز مہر بھی کہتے تھے، جس کے معنی ہیں "روح کی محبت"۔ ایرانی اس دن کو اپنی سب سے بڑی عید خیال کرتے تھے۔[65]

---

[62] پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ، دعوت اسلام (مترجم، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ) ص ۲۱۲، محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب، لاہور

[63] سید امیر علی، تاریخ اسلام، آزاد بک ڈپو، امرتسر ص ۱۵۸

[64] قاضی اطہر مبارکپوری، خلافت عباسیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۲ء ص ۲۸۹

[65] ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کی سیاسی تاریخ (مترجم، علیم اللہ صدیقی) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء جلد دوم،

ان دونوں تہواروں کے انعقاد میں عباسی خلفا کی دلچسپی اور اس کے لیے خصوصی مذہبی مراعات اور ان میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ شرکت، بین المذاہب ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چنانچہ عباسی دائرۂ حکومت میں غیر مسلموں کے بہت سے عبادت خانے آباد رہے اور مذہبی رسوم نہایت ہی تزک واحتشام سے منعقد ہوتے رہے۔ مؤرخ حسن ابراہیم حسن نے ان عبادت خانوں میں خصوصیت کے ساتھ دو عبادت خانوں کو ذکر کیا ہے جن میں ایک گرجا نہر دجاج پر واقع ''دیر بغدادی'' ہے جو نصرانیوں کی جاگیر تھی اور دوسرا گرجا ''دیر عذاری'' ہے جس سے ملحق باغات میں بے شمار درخت تھے۔ ان باغات کو سیاحتی مقام کا درجہ حاصل تھا اور لوگ وہاں تفریح اور آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے جاتے تھے۔

مذہبی اغراض کے لیے قائم شدہ عبادت خانوں اور خانقاہوں کے لیے خصوصی مراعات کا ذکر کرتے ہوئے رئیس احمد جعفری نے خلیفہ ہارون رشید کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ شکار کی غرض سے ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا، جہاں ایک عیسائی راہب کی خانقاہ تھی۔ راہب کی دعوت پر وہ خانقاہ میں گیا، وہاں کھانا کھایا اور وہاں کے انتظام و انصرام سے اتنا خوش ہوا کہ تمام دن خانقاہ میں ٹھہرا رہا اور راہب کی مہمان نوازی و فیاضی سے متاثر ہو کر اسے ایک ہزار دینار بطور انعام دیا اور اس کی خانقاہ کے متعلق جو مزروعہ زمینیں یا باغات تھے ان کا کل محصول اور لگان سات سال کے لئے معاف کر دیا۔[66]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلفاء عباسیہ کے دور میں غیر مسلموں کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مشترکہ معاشرت اور معیشت کا تقاضا بھی تھا کہ مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں میں باہمی میل جول اور خوش گوار تعلقات قائم رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک کریں۔ عباسی خلفاء نے ان باتوں کا پورا لحاظ رکھا اور ذمیوں کے مذہبی معاملات میں کوئی بے جا مداخلت نہ کی۔ بعض خلفاء نے ان ذمیوں سے غیر معمولی رواداری اور یگانگت کا سلوک کیا تھا، وہ ان کے جلوس میں شرکت کرتے تھے، ان کی عیدوں میں شریک ہوتے تھے اور ان کے معاشرتی، مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے خاص طور پر احکامات صادر کرتے تھے۔[67]

ص ۳۷۷

66 رئیس احمد جعفری، خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد، مقبول اکیڈمی لاہور ۲۰۰۳ء ص ۴۹۔۴۸

67 ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کی سیاسی تاریخ (مترجم، علیم اللہ صدیقی) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء جلد دوم، ص ۷۰۹۔۷۰۸

غیر مسلموں کے ان حقوق میں جائیدادوں کا تحفظ بہت ہی اہم ہے کیونکہ ایک مثالی کثیر المذاہب معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنی جائیداد پر مکمل قبضہ اور اسے خرید وفروخت اور آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کا مکمل اختیار ہو۔ عہد عباسی میں اس کا بھرپور خیال رکھا جاتا تھا اور اگر کسی سرکاری یا نجی ضرورت کے لیے اس جائیداد کی ضرورت پیش آتی تو خلفا باہمی رضامندی سے یہ سودا طے کرتے اور کسی قسم کی زور زبردستی کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ مصری مؤرخ حسن ابرہیم حسن نے آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس نے اپنے دارالحکومت کے لئے نئے شہر سامرّا کی تعمیر کے لئے عیسائیوں سے ان کی زمین اور باغ باقاعدہ قیمت دے کر خریدا جس کے لیے اس نے اپنے وزیر احمد بن خالد کو مامور کیا تھا۔ احمد بن خالد نے عیسائیوں کا ایک گرجا اور گرجا کے قریب کا ایک باغ پانچ پانچ ہزار دینار میں خریدا۔ اس کے علاوہ بعض دوسری زمینیں اور آس پاس کے کچھ مکانات بھی خریدے اور معتصم باللہ کو اس خرید وفروخت کی اطلاع دی۔[68]

غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری اور ان کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ تعلقات عباسی حکمرانوں کا طرہ امتیاز تھا اور یہ تعلقات صرف معاشرتی یا رفاہی واخلاقی حد تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ عباسی خلفا غیر مسلموں کے علم و ہنر اور صلاحیت و قابلیت سے بھرپور استفادہ بھی کرتے تھے اور حسب لیاقت انہیں معاشی، معاشرتی، سیاسی، فوجی، تعلیمی اور انتظامی امور کی ذمہ داریاں بھی سونپتے تھے اور انہیں اعلیٰ مناصب پر فائز کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

عباسی حکومت میں غیر مسلموں کو ہر قسم کے ملکی اور شہری حقوق حاصل تھے، نہ صرف ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی جاتی تھی بلکہ ان پر پورے طور سے اعتماد کیا جاتا تھا حتی کہ انہیں اسلامی فوج میں بھی جگہ دی جاتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ کسی قوم یا جماعت کو فوج میں رکھنا ان پر انتہائی اعتماد اور اطمینان کی بات ہوتی ہے۔ گویا مسلمانوں نے ان پر بھرپور اعتماد کیا۔ ذمیوں کو فوجی ملازمت میں رکھا اور ان کی صلاحیتوں سے بھر استفادہ کیا۔ بغیر کسی رنگ ونسل اور مذہبی تفریق کے انہیں حسب لیاقت منصب پر فائز کیا۔ قاضی اطہر

---

[68] ماخذ سابق، ص ۶۹۹

مبارک پوری نے غیر مسلموں کے تعلق سے عباسی حکمرانوں کی فراخدلی اور عدم تعصب کے مظاہرے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہارون رشید کے زمانے میں خراسان کی ایک مہم کے تعلق سے فضل بن یحی نے ''عباسیہ'' کے نام سے اہل عجم کی ایک فوج تیار کی جس میں تقریباً پانچ لاکھ سپاہی تھے جن میں عجم کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کے سپاہی بھی تھے۔ اس فوجی گروپ میں سے بیس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک دستہ بغداد روانہ کیا گیا جسے کرمینیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان دونوں فوجی جماعتوں میں ہندوستانی فوجی اپنی بہادری اور جوانمردی کی وجہ سے کافی شہرت پاچکے تھے۔[69]

مسلم فوج میں غیر مسلموں کی شرکت صرف عام سپاہیوں اور جنگجوؤں کی حد تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ انہیں اعلی عہدوں پر بھی فائز کیا جاتا تھا اور فوج کی قیادت بھی ان کے سپرد کی جاتی تھی۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے دوسری صدی میں غیر مسلموں کو فوجی قائد بنائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

> بغداد اور اندلس میں بہت سے نصاری کو اسلامی فوج کی قیادت سپرد کی گئی۔ اس پر علی بن عیسی نے عباسی وزیر حسن بن فرات پر اعتراض کیا اور کہا تم کو ایک نصرانی کو مسلمان فوجوں کی قیادت سپرد کرنے میں خدا کا خوف نہیں کیونکہ ان کے ہاتھوں کو دین کے انصار اور ملک کے محافظ تک بوسہ دیتے ہیں۔ ابن فرات نے جواب دیا کہ میں نے اس کی ابتدا اور نئی بات نہیں کی۔ مجھ سے پہلے مستنصر باللہ اپنے نصرانی کاتب اسرائیل کو اور معتضد باللہ امیر بدر کے عیسائی کاتب مالک بن ولید کو فوج کا قائد بنا چکا ہے۔ علی بن عیسی نے کہا: انہوں نے بھی صحیح نہیں کیا تھا۔ ابن فرات نے جواب دیا: گو انہوں نے تمہارے نزدیک غلطی کی ہو لیکن میرے لئے ان دونوں کی مثال کافی ہے۔[70]

اسی طرح معتمد کے عہد خلافت (۸۷۰ء تا ۸۹۲ء) میں اس کے بھائی الموفق (جو امور سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا) نے اپنی فوج کا بندوبست اسرائیل نام کے ایک عیسائی کے سپرد کر رکھا تھا۔ ان کے بعد خلیفہ مقتدر (۹۰۸ء تا ۹۳۲ء) نے بھی اپنے دور میں بھی فوج کا دفتر (محکمہ) ایک عیسائی کی تحویل میں دے رکھا تھا۔[71] گویا مسلم حکمرانوں اور امرا کا مسلم فوج کی قیادت غیر مسلموں کے سپرد کرنا اس بات کی شہادت ہے کہ اپنے

---

[69] قاضی اطہر مبارکپوری، خلافت عباسیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۲ء ص ۲۸۸

[70] شاہ معین الدین احمد ندوی، اسلام اور عربی تمدن، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی۔ ۲۰۱۰ء ص ۲۱۵

[71] پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ، دعوت اسلام (مترجم، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ)، محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب، لاہور ص ۶۸۔۶۷

قدر شناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت ہی مخلصانہ تھے۔

عباسی خلفا کے دور میں فوجی امور کے علاوہ دیگر نظم و نسق کے تمام بڑے بڑے عہدوں کے دروازے بھی مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں پر کھلے ہوئے تھے [72]، جس کا اندازہ مشہور مستشرق پروفیسر فلپ۔ کے۔ حتیHitti کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:

> خلفا کی سرپرستی میں نصرانیوں کے ساتھ بہت زیادہ رواداری برتی جاتی تھی۔ حد یہ کہ نویں صدی کے نصف آخر میں بعض نصرانی وزارت جیسے بڑے منصب پر فائز کئے گئے تھے۔ ایسے نصرانی اعلی عہدہ داروں کا ویسا ہی ادب کیا جاتا جیسا کہ عام قاعدہ تھا۔ کیوں کہ ہمیں تاریخوں میں یہ بیان بھی ملتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو ان عہدیداروں کے ہاتھوں پر بوسہ دینے میں تامل تھا۔[73]

اسی طرح عباسی خلیفہ معتضد (۸۹۲ء۔ ۹۰۲ء) نے ایک عیسائی عمر بن یوسف کو اس بنیاد پر انبار کا حاکم مقرر کیا کہ وہ اس عہدہ کے قابل تھا اور اس نے اس تقرری کے تعلق سے کہا کہ اگر کوئی عیسائی کسی عہدے کے قابل اور لائق مل جائے تو اسے بھی مامور کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ معتضد کے عہد میں دار الخلافت اور صوبوں میں کئی یہودیوں کو حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔[74]

عباسی عہد میں مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کئے بغیر تعلیم کی فراہمی پر توجہ دی گئی تھی۔ مختلف مذاہب کے علما اور ماہرین علم و فن کو اپنے تعلیمی اداروں کی ذمہ داری تک سونپ دی گئی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی کے مطابق خراسان میں مامون کے ذریعے بنائے گئے کالج کا پرنسپل یسوع نامی عیسائی کو مقرر کیا گیا تھا۔[75] دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے جندیسا پور کی طبّی درس گاہ کے پرنسپل جرجیس کو بغداد طلب کیا اور یہ پہلا عیسائی طبیب ہے جو عباسی دربار میں بلایا گیا اور شاہی طبیب بنایا گیا۔ نوبخت اور اس کا بیٹا ابو سہل جو آتش پرست تھا، شاہی منجم کے عہدے پر فائز تھا، خلیفہ مہدی کے دربار میں ایک عیسائی منجم توفیل بن توما تھا، خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں جبرئیل نامی ایک عیسائی مشہور طبیب تھا۔ جبرئیل کو ہارون رشید

---

[72] سید امیر علی، تاریخ اسلام، ص ۲۸۸، آزاد بک ڈپو، امرتسر

[73] پروفیسر فلپ۔ کے۔ حتی، عرب اور اسلام (مترجم، پروفیسر سید مبارز الدین رفعت) ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۹ء ص ۱۳۲

[74] پروفیسر فلپ، کے، حتی، تاریخ ملت عربی (مترجم: سید ہاشمی فرید آبادی) بک سینٹر ڈگی روڈ، علی گڑھ۔ ۱۹۷۲ء ص ۴۸۸

[75] علامہ شبلی نعمانی، المامون، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء ص ۱۵۸

نے کثیر جاگیروں اور صلوں کے ساتھ ہی یہ عزت بھی دی تھی کہ دربار میں جو شخص کوئی حاجت پیش کرنا چاہتا۔اس کو پہلے جبرئیل کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔اس کا بیٹا بختیشوع قدر و منزلت کے اس پایہ تک پہنچا کہ لباس و آرائش میں خلیفہ متوکل علی اللہ کا ہمسر شمار کیا جاتا تھا۔[76] ہارون رشید نے یوحنا کو علم طب اور دیگر فنون کی قدیم کتابوں کا عربی ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا۔منکہ ہندی کو یحیٰ برمکی نے ہارون کے علاج کے لئے بغداد بلایا تھا۔مامون رشید کا مصاحب خاص یوحنا عیسائی تھا جسے مامون نے طب اور فلسفہ کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا تھا۔مامون نے ایک عیسائی عالم حنین ابن اسحاق کو تمام مترجموں کا افسر مقرر کیا تھا۔ معتصم باللہ کا طبیب خاص سلمویہ بن بتان بھی ایک نصرانی تھا جسے خلیفہ کے دربار میں وقار واحترام حاصل تھا۔ خلیفہ معتصم باللہ حکیم سلمویہ کی بیماری میں خود عیادت کو جاتا تھا۔

اس کے علاوہ عیسائیوں نے ریاضی اور ہیئت کے میدان میں بہت ترقی کی تھی۔اس لئے محکمہ تعمیرات میں بھی انہوں نے اہم مقام حاصل کیا۔عباسیوں نے تعمیرات کے میدان میں غیر مسلم ماہرین تعمیرات کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔صرف بغداد میں ہی تقریبا پچاس ہزار صناع تھے۔ان میں عیسائی معماروں کی کثرت تھی اور عیسائی محلے آباد تھے۔

ان واقعات سے عباسی حکمرانوں کی اعلیٰ ظرفی کے ثبوت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں نے ہر مقام پر اپنے فرائض و خدمات انجام دینے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا جس کی وجہ سے ان کے ساتھ عباسی حکمرانوں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اچھے تعلقات اور مراسم قائم تھے اور ان پر اطمینان بخش اعتماد بھی تھا۔یہی وجہ تھی کہ علمی اور تربیتی اور انتظامی ادارے کے سربراہان میں بھی متعدد غیر مسلم علما، اطباء، معماران اور ماہرین فن نظر آتے ہیں۔

عباسی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کے تعلق سے ایک نہایت ہی اہم دستاویز ڈاکٹر منگانا پروفیسر علوم شرقیہ مانچسٹر یونیورسٹی نے دریافت کی۔ڈاکٹر موصوف نے اس دستاویز کو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔اس دستاویز کی حقیقت ایک میثاق کی ہے، جسے ''میثاق مقتفی'' کہا جاتا ہے، اور جسے عباسی خلیفہ المقتفی لامر اللہ بن المستظہر (۱۱۳۶ء تا ۱۱۶۰ء) نے

---

[76] ماخذ سابق، ص ۱۶۱

عیسائی رعایا کے اسقف اعظم عبدیشوع ثالث کو دیا تھا۔ ڈاکٹر منگانا کے مطابق ''میثاق مقتفی''، مسلم حکمرانوں کے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کی شروعات نبی پاک ﷺ کے مکاتیب سے ہوتی ہے جو ہرقل روم اور کسرائے عجم و فرماں روائے مصر کو بھیجے گئے۔ یہ معاہدے مختلف دور میں مسلم حکمرانوں کے ذریعے عروج و ارتقا کی منزلیں طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ''میثاق مقتفی'' کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت ہی اعلی و ارفع سلوک پر زور دیا گیا ہے، جو تاریخی طور پر اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ اسلام اور مقتدیان اسلام نے اپنے برابر والوں یا ماتحتوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری، عدل و انصاف کی تلقین کی ہے جس پر چند مستثنیات سے قطع نظر ہمیشہ عمل ہوتا رہا۔

میثاق مقتفی بارہویں صدی میں تحریر کی گئی ہے جس میں خلیفہ مقتفی نے اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ ہر طرح کی مراعات اور رواداری کا وعدہ کیا ہے۔ اس میثاق کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرمان معلّٰی اعلیٰ حضرت امیر المومنین خلیفۃ الرسول خلیفہ مقتفی بن مستظہر کی طرف سے عبدیشوع اسقف نسطوری کے نام:

الحمد للہ کہ اس ذات واحد نے حضرت خلیفۃ الرسول کو امیر المومنین بننے کی توفیق عطا فرمائی اور اسے وہ رتبہ بخشا جو اسے انسانوں میں بلند کرتا ہے اور جس کے رعب سے دشمن خوف کھاتے ہیں۔ جس نے زیور عدل کو جلا دی اور امن اور ترقی کے راستوں کو کھولا۔ مسلمانوں اور ذمیوں کی حفاظت اس کا مخصوص فرض ہے۔ کیونکہ یہ رسول اللہ کا فرمان ہے۔ اے اسقف! امیر المومنین نے تیری التجا کو سنا اور اسے قبول فرمایا اور حکم دیا کہ پیروان مسیح ناصری اپنے اوقاف، اپنے کلیسا اور رسومات مذہبی کی تنظیم کے لئے اپنے میں سے کسی کو منتخب کر لیں۔ اجازت ہے اور یہ حکم سابقہ احکام کی تصدیق اور تجدید کرتا ہے اور جملہ ممالک خلافت اسلامیہ میں عیسائی مذہب کو امان دیتا ہے۔ نیز تمام یونانیوں، جیکو بائیٹس اور ملیشین کو اسقف نسطوری کی پناہ میں دیتا ہے، نیز اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ذمیوں کے واجبات صرف بالغ مردوں سے وصول کئے جائیں گے اور دیگر تمام اصناف اس سے مستثنی رہیں گے۔ اس میثاق کا یہ بھی وعدہ ہے کہ حصول انصاف میں ذمیوں یا دیگر غیر مسلموں کے ساتھ خالص انصاف ہو گا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

امیر المومنین متوقع ہیں کہ راہبان، اسقفان و پیروان ناصری، خلافت اسلامیہ کے عقیدت شعار رہیں گے اور اپنے خدا سے اس کی بہبودی کے لئے دست بدعا ہوں گے۔

ڈاکٹر منگانا کا بیان ہے کہ اس میثاق پر بلا کم و کاست عمل ہوتا رہا۔ حتی کہ آج بھی نسطوری فرقہ تیرہ سو سال تک اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے کے باوجود نہایت آزادی سے اپنے مشاغل میں مصروف ہے اور کسی مسلمان صاحب اختیار نے ان کے حقوق کو پامال نہیں کیا۔[77] خلفائے بنی عباس کی پابندیِ عہد و رواداری و پاسداریِ حقوق کی صدہا دیگر مثالیں تاریخی واقعات اور حقائق کی شکل میں کتب تواریخ میں درج ہیں جو اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ عزت و وقار اور حسن سلوک کے معاملات کو ظاہر کرتی ہیں۔ عصر حاضر میں عباسی دور میں قائم ہونے والے مسلم، غیر مسلم تعلقات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے اور اس کے نتائج سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

مطبوعات دار المصنفین

قرآنیات

ارض القرآن حصہ اول و دوم

از مولانا سید سلیمان ندوی

عرب کا قدیم جغرافیہ عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق ثابت کی ہے۔ حصہ دوم میں قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے ان میں سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث۔

صفحات ۵۵۱/قیمت ۳۷۵ روپے

[77] بحوالہ ملک عبد القیوم بار ایٹ لا، سابق مدیر مسلم اسٹنڈرڈ، لندن، ماہنامہ دین دنیا دہلی، مارچ ۱۹۵۴ء ص ۲۸۔ ۳۰

اسلام میں اختلاف کی حیثیت

اور اس کے اصول و آداب، اسلاف کے فکر و عمل کے آئینے میں

ڈاکٹر وارث مظہری

wmmazhari@jamiahamdard.ac.in

اختلاف انسانی فطرت کا خاصہ اور اس کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک ہے۔ اسے انسانی زندگی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کہتا ہے: ”یہ لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کا رب رحم فرمائے“ (ہود: ۱۱۸)۔ علامہ الشریف الجرجانی نے اختلاف (الخلاف) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: منازعة تجری بین المتعارضین لتحقیق حق أو ابطال باطل[1] (حق کے اثبات اور باطل کے ابطال کے لیے دو فریقوں کے درمیان جو بحث و مباحثہ ہو اس کا نام اختلاف ہے)۔ اسلام میں تعمیری اختلاف سے منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ سے منسوب مشہور حدیث ہے: اختلاف أمتی رحمة۔ ”میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے“[2]۔ اس حدیث کی سند اگرچہ کمزور ہے لیکن اپنے معنی کے لحاظ سے وہ قوی ہے اور اسلاف نے اس سے استدلال کیا ہے۔ علمائے اسلاف میں سے بعض جلیل القدر شخصیات کے اقوال سے بھی اس حدیث کے معنی و مراد کی وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں: ”اگر صحابہ کرام اختلاف نہ کرتے اور یک رائے ہو جاتے تو لوگ تنگی میں مبتلا ہو جاتے“ (کان الناس فی ضیق)[3]۔ معروف تابعی ابو اسحاق سبیعی کا قول ہے: ”اہل علم اس وسعت کو دین میں مدد تصور کرتے تھے“۔ اس کی مزید وضاحت ابن قدامہ حنبلی کے اس جملے سے ہوتی ہے: ”اہل علم کا اتفاق حجت قاطعہ

---

[1] علی بن محمد السید الشریف الجرجانی: معجم التعریفات، تحقیق و دراسة: محمد صدیق المنشاوی، قاہرہ: دار الفضیلة، بدون تاریخ، رقم المصطلح ۸۲۶، ص ۸۹۔

[2] جلال الدین السیوطی: تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی، حققہ ابو قتیبہ نظر الفاریابی، الریاض: مکتبة الکوثر ۱۴۱۵ھ: ج ۱، ص ۶۲۵۔

[3] ابن عبد البر: مختصر جامع بیان العلم وفضلہ، اختصرہ احمد بن عمر المحمصانی البیروتی، بیروت: دار الخیر، ۱۹۹۴، ص ۲۵۴۔

ہے اور اُن کا اختلاف رحمت واسعہ ہے"[4]۔

علما و اصحاب فضل کے اس قبیل کے متعدد اقوال ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف اگر اپنی حدود میں، حسن نیت اور تعمیری مقصد سے ہو تو وہ امت کے حق میں سراسر رحمت اور خیر کا باعث ہے۔ تاہم اس ضمن میں اختلاف اور افتراق کے فرق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اختلاف کا مطلب ہے رائے اور فہم کا اختلاف۔ اس بنیاد پر عمل میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ اختلاف دلوں کو بانٹنے والا، اجتماعیت میں خلل ڈالنے اور انتشار پیدا کرنے والا نہیں ہوتا جب کہ "افتراق" دراصل فرقوں اور گروہوں میں بٹ جانا ہے جس کی اسلام میں مذمت کی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی (ستفترق ھذہ الامۃ علی ثلاث و سبعین فرقۃ)[5]۔ یا اسی طرح قرآن میں کہا گیا: "تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جو باہم اختلاف و افتراق میں مبتلا ہو گئے" (آل عمران: ۱۰۵)۔

اسلام میں فکری اختلاف کے اصول و آداب

اسلامی فکری روایت میں اصولی طور پر اختلاف کی دو بڑی قسمیں کی گئی ہیں: اختلاف محمود و مقبول اور اختلاف مذموم و مردود۔

اختلاف محمود کی اہم خصوصیات یہ ہیں

وہ صحیح نیت اور قصد سے کیا جائے۔ اس کا مطلوب و مقصود صرف جستجوئے حق اور تلاش معرفت ہو۔ اختلاف کرنے والے کے پیش نظر کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔ اختلاف کے عمل میں عصبیت اور عناد کو کوئی دخل نہ ہو۔ مجتہد فیہ امور میں اختلاف کرنے والا شخص خود کو حق کا اجارہ دار تصور نہیں کرتا بلکہ وہ یہ گمان رکھتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ دوسرا فریق ہی حق پر ہو اور وہ غلط موقف پر قائم ہو۔ حدیث میں جس اختلاف کو رحمت بتایا گیا ہے وہ یہی اختلاف ہے۔ اسلام میں اس اختلاف کو نہ صرف یہ کہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

---

[4] ابن قدامۃ الحنبلی: مقدمہ کتاب المغنی، تحقیقعبد اللہ فن عبد المحسن الترکی وعبدالفتاح محمد الحلو، ج۱، الریاض: دار عالم الکتب، ۱۹۹۷ ص ۴

[5] ابو داؤد: ۹۳

صحابہ کرام اور سلف صالحین کے درمیان عموماً اختلاف کی نوعیت یہی تھی۔ اس لیے وہ امت کے حق میں سراسر رحمت ثابت ہوا۔ اس سے شریعت کے احکام میں وسعت و گنجائش پیدا ہوئی اور آسانی کا راستہ کھلا جو شریعت کا مقصود و مطلوب ہے کیوں کہ رسول اللہ کی حدیث کے مطابق ''دین آسان ہے''(الدین یسر)[6]۔ اوپر عمر بن عبد العزیز اور بعض دوسری اکابر شخصیات کے جو اقوال گزرے، وہ دراصل اسی اختلاف کی مدح میں ہیں۔ فقہا و مجتہدین کے درمیان پایا جانے والا اختلاف اسلام میں اختلاف محمود کی روایت کی عظیم الشان مثال ہے۔ اختلاف محمود کا محرک صرف حق کا حصول ہوتا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ حق کس کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی شناخت یہ ہے کہ اس سے اتحاد و اجتماعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب خیر غالب تھا، امت کے درمیان مختلف امور میں کثرت سے اختلافات ہوئے لیکن چندے استثنا کے ساتھ اسلامی اجتماعیت اپنی جگہ برقرار و محفوظ رہی لیکن بعد کے زمانوں میں امت کے اندر اختلاف محمود کی جگہ اختلاف مذموم نے لے لی جس نے امت کو زوال و انتشار کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔

اختلاف مذموم کا قرآن کی مختلف آیات میں ذکر کیا گیا ہے

''پھر جماعتیں آپس میں اختلافات میں مبتلا ہو گئیں''(مریم: ۳۷)، ''تمہارا رب ان کی اس بات کا قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں''(یونس: ۹۳)۔ اختلاف مذموم کی خصوصیات اختلاف محمود کی اُن خصوصیات کے برعکس ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اختلاف مذموم کے پیچھے صرف نفسانی خواہش اور ذاتی غرض کارفرما ہوتی ہے۔ حق کی تحقیق و جستجو کے بجائے اس کا مقصد صرف اپنی انا کو غالب رکھنا ہوتا ہے جب کہ قرآن میں واضح طور پر اس سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے: ''تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کیوں کہ وہ تمہیں اللہ کر راہ سے بھٹکا دے گی''(ص: ۲۶) اسی معنٰی میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا : الخلاف شر یعنی ''اختلاف سراپا شر ہے''[7]۔ یہ اختلاف برائے اختلاف ہوتا ہے جس کو مخالفت کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

علامہ ابو البقا کفوی نے 'اختلاف' کو اختلاف محمود اور 'خلاف' کو اختلاف مذموم کے معنی میں استعمال

---

[6] بخاری: ۳۹

[7] ابو داؤد: ۱۹۶۰

کرتے ہوئے، اختلاف محمود و مذموم کی زمرہ بندی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

الاختلاف هو ان یکون الطریق مختلفا والمقصود واحدا والخلاف ان یکون کلاهما مختلفا۔الاختلاف مایستند الی دلیل والخلاف مالایستند الی دلیل۔والاختلاف من آثار الرحمة۔۔۔والخلاف من آثار البدعة[۸]۔

اختلاف یہ ہے کہ مقصد ایک ہی ہو خواہ اس کے راستے مختلف ہوں اور خلاف (بمعنی اختلاف مذموم) یہ ہے کہ مقصود اور طریق کار دونوں مختلف ہوں۔ اختلاف (اختلاف محمود) کی بنیاد دلیل پر ہوتی ہے جب کہ خلاف (اختلاف مذموم) کوئی (مضبوط) دلیل نہیں ہوتی۔ اختلاف آثار رحمت ہے اور خلاف آثار بدعت میں سے ہے۔

اپنے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مقصود اور غایت میں اتحاد کے ساتھ وسائل و ذرائع میں اختلاف ہو اور خلاف یہ ہے کہ وسائل و مقاصد دونوں الگ الگ ہوں۔ خلاف کے اندر نزاع، انتشار اور حقیقی افتراق و علاحدگی پائی جاتی ہے، جب کہ اختلاف میں لفظی فرق ہوتا ہے نہ کہ حقیقی۔

اختلاف مذموم سے ہی ''تفرق'' (گروہوں میں بٹ جانا) پیدا ہوتا ہے جس سے قرآن کی متعدد آیات میں منع کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں اس اختلاف مذموم سے امت کے مختلف طبقات میں کش مکش کی کیفیت پیدا ہوئی اور اس سے سامنے آنے والی تشدد پسندی کی صورت حال سے اسلامی اجتماعیت پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ سارے نزاعات باہمی تصادمات اور جھگڑوں کی بنیاد اسی اختلاف مذموم پر ہے۔

اختلاف کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ اختلاف اس خلوص نیت سے کیا جائے کہ حق واضح اور بے غبار ہو کر سامنے آجائے خواہ وہ اپنی زبان سے ہو یا اپنے مخالف کی زبان سے۔ وہ تعمیر کی نیت سے کیا جائے نہ کہ تخریب کی نیت سے۔ قرآن کے مطابق (النحل، ۱۲۵) اختلاف کے لیے نہایت خوشگوار طریقہ (قرآن کے لفظ میں ''احسن'') اختیار کیا جانا چاہیے۔ خوشگوار طریقہ یہ ہے کہ ایسا طرز اختیار نہ کیا جائے جس سے فریق مخالف کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو جیسے طنز و تمسخر، دوسروں کے سامنے مخالف کی کمزوری کا اظہار اور اظہار مدعا میں جارحانہ اور تشدد آمیز اسلوب اختیار کرنا وغیرہ۔ اختلاف رائے کے اظہار میں حکمت و موعظت کا اسلوب اختیار کیا جانا چاہیے۔ کسی مرحلے میں اگر اپنی رائے کی کمزوری واضح ہو جائے تو ضروری ہے کہ حق

[8] ابوالبقا الکفوی: الکلیات: معجم فی المصطلحات والفروق اللغویة، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ: ۱۹۹۸ص، ۶۰

کا اعتراف کر لیا جائے۔ خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنا محض انانیت اور کبر کی علامت ہے جو اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ اختلاف کرنے والے کو اس بات سے اختلاف کرنا چاہیے جو اس کی نظر میں اصولی اور واضح طور پر غلط ہو لیکن فریق مخالف کی جو باتیں حق کے خلاف نہ ہوں ان کا اعتراف کرنا اور ان کو قبول کرنا چاہیے۔ جس طرح ایک صاحب علم واجتہاد کی تمام باتوں کو قبول کر لینا اور انہیں سو فیصد بر حق تصور کرنا غلط ہے کہ یہ مقام خدا کے بعد صرف رسول کو حاصل ہے، اسی طرح اس کی مستند باتوں سے انکار محض عناد اور جہالت کی علامت ہے۔ اختلاف، تواضع اور لچک کے ساتھ کیا جائے لیکن اظہار حق میں مداہنت سے کام نہ لیا جائے۔ اسی طرح فریق مخالف سے اسی وقت تک بحث و مباحثہ ضروری ہے جب تک کہ پیش کی جانے والی رائے سے تعلق رکھنے والے تمام پہلو مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آجائیں۔ تمام پہلوؤں کی حتی الوسع وضاحت و تصریح کے بعد بحث کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا چاہیے۔ چاہے فریق مخالف کا ذہن مطمئن ہو یا نہ ہو۔ اپنی بات کو منوا لینے کی کوشش کا انجام کبھی مثبت نہیں ہوتا۔ وہ نزاع کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ قرآن میں مشرکین کے اس رویے کی ان الفاظ میں مذمت کی گئی ہے: ''وہ اپنے حق کے بارے میں جھگڑتے ہیں جب کہ حق اچھی طرح واضح ہو چکا ہے'' (الانفال:۴۶)۔

صحابہ وتابعین کے درمیان اختلاف کے مظاہر اور ان کا طرز عمل

صحابہ کرام پاک نفس و پاک باز شخصیت کے مالک تھے جو رسول اللہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ لیکن وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ ان سے خطائیں سرزد ہوئیں لیکن وہ اپنی خطاؤں پر قائم رہنے والے نہیں تھے۔ صحابہ کرام کے مابین مختلف امور و معاملات میں بہت سے اختلافات کے واقعات پیش آئے لیکن عموماً یہ اختلافات ادب کے دائرے سے باہر نہیں نکلے۔ سب سے بڑا اختلاف رسول اللہؐ کی جانشینی کے مسئلے پر ہوا لیکن حضرت ابو بکرؓ کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے کہ رسول اللہؐ کی حدیث کے مطابق، خلیفہ قریشی ہوگا[9]، اصحابہ کی جماعت نے اپنا اختلاف ختم کر دیا اور ابو بکر کی خلافت پر راضی ہو گئی۔ ایک دوسرا بڑا اختلاف زکات دینے سے انکار کرنے والوں کے بارے میں ہوا۔ خود حضرت عمر جو حضرت ابو بکر کے بعد صحابہ میں دوسری عظیم ترین شخصیت کے مالک تھے، صرف زکات سے انکار کی بنیاد پر جنگ و جدال کو درست نہیں سمجھتے تھے

---

[9] مسند احمد: ۲۳۲۹

لیکن حضرت عمرؓ کے ساتھ صحابہ کرام کی اس جماعت نے جو اس معاملے میں حضرت عمرؓ کے موقف کی مؤید تھی، اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور اختلاف اتحاد میں بدل گیا۔

ان کے علاوہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں اختلافات وہ ہیں جن کا تعلق فقہی احکام سے ہے: عبادات میں نماز، روزہ، حج، زکات، معاملات میں لین دین، خرید و فروخت وغیرہ۔ اسی طرح نکاح و طلاق، وراثت اور اس طرح کے دیگر بہت سے معاملات میں صحابہ کے درمیان نظری اختلافات پائے جاتے تھے جن میں سے بعض اختلاف کی نوعیت شدید ترین تھی۔ مثلاً: حضرت عمر و عبداللہ ابن عمر اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کو جائز تصور نہیں کرتے تھے، حضرت ابو طلحہ روزے کی حالت میں اولہ کھانا اور حضرت حذیفہ سورج نکلنے سے کچھ پہلے تک جبکہ روشنی پوری طرح پھیل چکی ہو، سحری کھانے کو جائز سمجھتے تھے[10]۔ چاروں خلفاء راشدین کے درمیان بہت سے مسائل میں نظریاتی اختلافات موجود تھے لیکن ان کے باہمی تعلقات پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ حضرت عمر فاروق، حضرت عبد اللہ ابن مسعود کو علم اور دینی تفقہ و بصیرت کا لبریز پیالہ (کنیف ملئ علما وفقها) کہتے اور سمجھتے تھے لیکن دونوں شخصیات کے درمیان تقریباً سو مسائل میں اختلافات پائے جاتے تھے[11]۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور زید بن ثابت کے درمیان وراثت کے بعض مسائل میں اتنے شدید اختلافات تھے کہ ابن عباس کہتے تھے کہ جو لوگ مجھ سے اختلافات کرتے ہیں وہ اور میں سبھی جمع ہو کر اللہ سے دعا کریں اور گڑ گڑائیں اور کہیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ لیکن ابن عباس کا احترام حضرت زید بن ثابت کے تعلق سے یہ تھا کہ ایک مرتبہ انھیں تشریف لاتے ہوئے دیکھا تو سواری کی رکاب تھام لی اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ حضرت زید نے کہا کہ اے رسول اللہ کے چچا کے بیٹے آپ اسے چھوڑ کر ہٹ جائیں اور ایسا نہ کریں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس نے کہا کہ ہمیں یہی سکھایا گیا ہے کہ اپنے علما اور بڑوں کے ساتھ ایسا ہی کریں۔ اس پر حضرت زید نے کہا: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں۔ حضرت ابن عباس نے ہاتھ آگے کیا جسے حضرت زید نے فوراً چوم لیا اور فرمایا ہم کو اہل نبی کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم اور تعلیم دی گئی

---

[10] ابن تیمیہ: قاعدة جليلة في التوسل والوسيلة، لاہور: ادارہ ترجمان السنۃ، بدون سنۃ، ص ۱۰۴۔

[11] طہ جابر علوانی، ادب الخلاف، ورجینیا، امریکہ، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، ۱۹۹۲، ص، ۴۷

ہے[12]۔

حضرت عائشہ نے کئی مسائل میں حضرت عبد اللہ ابن عمر سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ انھوں نے حدیث کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ لیکن ابن عمر نے رد عمل میں ان کی ذرا بھی کوئی بے احترامی نہیں کی۔ حضرات صحابہ کرام کے درمیان بہت سی شاذ رائیں اور تفردات بھی پائے جاتے تھے، جن کی کچھ مثالیں اوپر گزریں لیکن کسی صحابی سے دوسرے پر نظریاتی اختلاف کی وجہ سے لعن طعن منقول نہیں ہے۔

حضرات صحابہ ؓکرام کے اختلاف میں اتحاد کے یہ نمونے تابعین و تبع تابعین اور ائمہؒ مجتہدین کے لیے نقوش راہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات میں ان کے ایسے بہت سے واقعات اور مثالیں مذکور ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمی و فکری اختلافات کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے باہمی تعلقات و معاملات میں اسلام کی اصولی تعلیمات اور اخلاقی ہدایات پر عمل پیرا تھے۔ قاضی شریح سے متعلق منقول ہے کہ وہ قرآن کی بعض آیات کو متفق علیہ قرأت سے ہٹ کر پڑھتے تھے۔ ابراہیم نخعی تک یہ بات پہنچائی گئی تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ عبداللہ ابن مسعود ان سے زیادہ بڑے عالم تھے، وہ اس آیت کو اسی طرح پڑھتے تھے۔ اہم ترین مسائل میں اختلاف کی اس طرح کی مثالیں دور اول میں کثرت سے پائی جاتی تھیں لیکن وہ ہمیشہ علمی دائرے میں رہیں کسی نے ان کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ و بدعتی قرار نہیں دیا[13]۔

اسی طرح متعدد اجماعی مسائل میں صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے درمیان اختلافات کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایسے تمام مسائل میں انہوں نے دوسروں پر نکیر کی اور اپنا اختلاف ظاہر کیا لیکن اس کو کفر و ایمان کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تکفیر کی بدعت صحابہ و تابعین کے زمانے میں سب سے پہلے خوارج نے شروع کی جو اسلام کے نظری و عملی ڈھانچے میں بالکل ایک نئی چیز تھی۔ اس لیے امت کے اجتماعی ضمیر نے ان کی فکری روش کو قبول نہیں کیا اور ان کی فکر تاریخ اسلام کا پارینہ ورق بن کر رہ گئی۔

---

[12] محمد یوسف کاندھلوی: حیاۃ الصحابۃ ج ۳، ص ۳۰۔

[13] اس کی مثالوں کے لیے دیکھیے: یاسر برہامی: ادب الخلاف، المکتبۃ الشاملۃ، ص۔ ۹

ائمہ مجتہدین کے درمیان اختلاف کے مظاہر اور ان کا طرز عمل

صحابہ و تابعین کے درمیان اجتہادی و فقہی مسائل میں جو اختلاف پائے جاتے تھے، اس کی وراثت ائمہ مجتہدین کو بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ سینکڑوں امور و معاملات میں وہ باہم مختلف الرائے تھے۔ اس بنیاد پر ان کے درمیان متعدد مکاتب فقہ وجود میں آئے جن میں سے تقریباً آٹھ مکاتب فقہ سے اس وقت امت کی اکثریت وابستہ ہے۔ پانچ اہل سنت کے: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری یا اہل حدیث اور باقی تین میں سے دو اہل تشیع کے: جعفری اور زیدی اور آٹھواں مکتب فقہ اباضی ہے جس کی نسبت خوارج کے فرقہ اباضیہ سے ہے (لیکن موجودہ اباضی علما و اہل قلم اس نسبت سے انکار کرتے ہیں)۔

حضرت امام مالک کا قول ہے کہ کسی فقیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے مسلک کے اختیار کرنے پر مجبور کرے[14]۔ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اجتہادی مسائل میں نکیر نہ کی جائے اور کسی کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ ایسے مسائل میں اپنی رائے پر عمل کرنے کے لیے دوسروں کو مجبور کرے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف میں لکھتے ہیں:

> اکثر مسائل میں فقہا نے یہ علت بیان کی ہے کہ ان میں صحابہ کرام کا عمل مختلف ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سارے صحابہ حق پر تھے۔ اس لیے ہمیشہ علمائے کرام اجتہادی مسائل میں مفتیوں کے فتاوی کو جائز قرار دیتے اور قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے اور بعض مرتبہ اپنے مسلک کے خلاف رائے پر بھی عمل کرتے تھے۔ ائمہ فقہ کو دیکھیے کہ وہ ان مسائل میں ان کی تہہ تک جاتے ہیں، اختلاف کو واضح کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: ''یہ زیادہ احتیاط پر مبنی ہے'' (هذا احوط)، '' یہی پسندیدہ ہے'' (هذا هو المختار)، '' یہ میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے'' (هذا أحبُّ اليّ) ۔ اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھ تک بس یہی روایت پہنچی ہے۔ اس طرح کی مثالیں (سرخسی کی) المبسوط، امام محمد کے آثار اور امام شافعی کے اقوال میں بکثرت ملتی ہیں[15]۔

---

[14] محمد ابوزہرۃ، مالک: حیاته و عصره، آراؤه وفقهه، القاہرۃ: دار الفکر العربی، بدون سنۃ، ص، ۲۲۵

[15] شاہ ولي الله الدهلوي ، الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، مراجعۃ وتعلیق: عبد الفتاح ابوغدۃ، بیروت: دار النفائس: ۱۹۸۶، ج،۱، ص، ۱۰۸

اسی طرح ان فقہائے مجتہدین کے درمیان یہ تصور نہیں پایا جاتا تھا کہ حق صرف انھی کے ساتھ خاص ہے اور لامحالہ انھی کا استنباط قابل عمل ہے۔ جیسا کہ یہ ذہنیت بعد کے دور میں علمی حلقوں میں پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ ائمہ مجتہدین اور اُن کے فقہی بصیرت کے حامل لائق تلامذہ خود اپنے استاذ سے اختلاف کرتے اور بہت سے مسائل میں اپنے فقہی موقف سے ہٹ کر دوسرے مکاتب فقہ سے تعلق رکھنے والے مجتہدین کے اقوال پر عمل کر لیتے تھے۔ امام ابویوسف اور امام محمد نے بہت سے مسائل میں اپنے استاذ امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا۔ امام شافعی نے ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ کے مقبرے کے قریب فجر کی نماز ادا کی لیکن اپنے مسلک کے برخلاف اس میں قنوت نہیں پڑھی حالاں کہ وہ ان کے نزدیک سنت موکدہ ہے۔ لوگوں کے سوال پر فرمایا کہ کبھی کبھی ہم اہل عراق کے مذہب پر بھی عمل کر لیتے ہیں[16]۔ امام ابویوسف نے ایک مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھائی۔ انہوں نے ایک حمام سے غسل کیا تھا۔ نماز کے بعد انہیں بتایا گیا کہ جس حمام سے آپ نے غسل کیا تھا اس میں مردہ چوہا موجود تھا۔ احناف کے نزدیک اس صورت میں پانی پاک نہیں رہتا لیکن انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو ہم اس مسئلے میں اہل مدینہ کے مسلک پر عمل کرتے ہیں جن کے نزدیک ایسا پانی پاک ہے[17]۔

امام مالک اور ابوحنیفہ کے درمیان سیکڑوں مسائل میں جو اختلاف ہے وہ اہل علم پر واضح ہے لیکن ان دونوں کے درمیان باہمی احترام و قدرشناسی کی مثال یہ ہے کہ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ ایک روز میری مدینہ میں امام مالک سے ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ اس سے متعلق سوال پر فرمایا کہ میں ابوحنیفہ سے گفتگو کر کے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اے مصری! وہ واقعی فقیہ ہیں۔ لیث کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک دن میں نے ابوحنیفہ سے کہا کہ مالک نے آپ سے متعلق کتنی اچھی بات کہی۔ انہوں نے جواب یوں کہا کہ صحیح جواب اور بھرپور تنقید میں مالک سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں دیکھا[18]۔ امام بن حسن شیبانی کا قول ہے کہ اگر کسی کا اختلاف ہم پر غالب آیا تو وہ شافعی ہیں۔ جب مزید پوچھا گیا کہ اسکی وجہ کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کے حسن بیان کی وجہ سے اور اس لیے بھی کہ وہ غور سے سُن کر پوری ثابت قدمی کے ساتھ سوال و جواب کرتے

---

[16] ماخذ سابق، ص، ۱۱۰

[17] ماخذ سابق

[18] العلوانی، ادب الخلاف ص، ۱۲۲۔ ۱۲۳ بحوالہ ابن عبدالبر، الانتقاء فی فضائل الائمۃ الثلاثۃ الفقہاء ص ۱۴۔

تھے[19]۔ حنفی وشافعی مکاتب فقہ کے درمیان اختلاف کی جو حدت وشدت پائی جاتی ہے اس سے عہد وسطیٰ سے لیکر آج تک فقہی مجادلوں اور مناظروں کی مجلسیں آراستہ ہوتی رہی ہیں لیکن خود امام شافعی کا اپنے "حریف" کے بارے میں یہ اعتراف قابل غور ہے کہ لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں[20]۔

امام تیمیہ سے منقول ہے کہ امام احمد بن حنبل ان کے خلاف رائے رکھنے والے فرقوں سے انتساب رکھنے والے ائمہ مساجد کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ محدثین ومفسرین کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ان کی روایات تک اپنی کتابوں میں شامل کی ہیں۔ ان میں خود امام بخاری بھی شامل ہیں۔ انہوں نے خوارج اور شیعہ راویوں کی روایتیں بھی اپنی الجامع الصحیح میں شامل کی ہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمے "ہدی الساری" میں اٹھارہ ایسے راویوں کا تذکرہ کیا ہے جو شیعہ تھے اور ان کی روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں[21]۔ محدثین اہل سنت نے 'اہل بدعت' کی روایات اس اصول کے تحت اپنی کتابوں میں لی ہیں کہ وہ جھوٹ سے بچنے والے، قول کے سچے پکے (صدوق) ہوں اور اپنے مذہب کے داعی نہ ہوں۔

یہ اہل سنت کے فقہا وائمہ کے درمیان ادب اختلاف کے نظائر ہیں۔ دوسرے مکاتب فقہ میں سے جعفری فقہ کے ستون اعظم، جن سے فقہ جعفری منسوب ہے، یعنی حضرت امام جعفر صادقؒ وہ اور ان کے والد امام باقر دونوں امام ابو حنیفہ کے استادوں میں سے تھے۔ ابو حنیفہ کا قول ہے کہ میں نے جعفر صادق سے زیادہ بڑا فقیہ کسی کو نہیں دیکھا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میں کچھ عرصے تک جعفر بن محمد کے پاس آتا جاتا رہا۔ میں نے انہیں ہمیشہ تین حالتوں میں سے ایک میں پایا: نماز کی حالت میں یا روزے کی حالت میں یا قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔ علم اور عبادت میں کسی نے جعفر بن محمد سے بڑھ کر نہ کسی کو دیکھا اور نہ سنا[22]۔

---

[19] اس نوع کے تفصیلی مطالعے کے لیے رجوع کریں: علوانی، ادب الخلاف، ص ۱۲۲۔۱۲۳۔

[20] ابوزکریا یحی بن ابراہیم السلمانی، منازل الآئمۃ الاربعۃ: ابی حنیفۃ ومالک والشافعی واحمد، المدینۃ المنورۃ: ۲۰۰۲ ص، ۱۷۰

[21] ابن حجر العسقلانی: ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری، الفصل التاسع، دیوبند: مکتبہ شیخ الہند، ۲۰۰۶، ص ۳۳۵۔۳۴۰۔

[22] امین الخولی، مالک: تجارب حیاۃ، القاہرۃ، المؤسسۃ المصریۃ العامۃ، للتالیف والترجمۃ والطباعۃ والنشر، بدون سنۃ، ص، ۱۰۵

موجودہ منظر نامہ

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ فکری اختلاف نے نزاع و شقاق کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اسلامی فکری روایت اس کے ہاتھوں شکست وریخت کی شکار ہے۔ اس کا ایک اہم مظہر تکفیر اور تضلیل و تفسیق کی روش ہے۔ ہمارے علمی و دینی حلقوں میں آزادی فکر و نظر کو پابند سلاسل کرنے اور اس پر قدغن لگانے کی جو کوششیں کی جاتی رہی ہیں، تکفیر و تفسیق کو اس کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ صحابہ و تابعین کے اور ائمہ مجتہدین کے مثالی دور میں اس کے واقعات نہیں ملتے۔ حالاں کہ ان کے درمیان مختلف دینی امور میں شدید ترین نظریاتی اختلافات پائے جاتے تھے اور کبھی یہ اختلافات شدید تر بھی ہو جاتے تھے۔ حضرت قدامہ بن مظعون نے، جو بدری صحابی تھے، شراب پی اور حضرت عمر کی طرف سے اس بابت سوال اور محاسبے پر اپنے اس فعل حرام کے جواز میں قرآن کی ایک آیت (المائدۃ: ۱۹۳) سے استدلال کیا۔ صحابہ کرام کے مشورے سے، جن میں حضرت علی اور عبداللہ ابن عباس شامل تھے، حضرت عمرؓ نے ان پر حد جاری کی لیکن ان کی تکفیر نہیں کی[23]۔ سیاسی سطح پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے اختلافات نے تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا لیکن ان نظری و سیاسی اختلافات نے کبھی تکفیر کی شکل اختیار نہیں کی۔ خوارج حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سمیت اکثر صحابہ کی تکفیر کرتے اور انہیں مباح الدم سمجھتے تھے لیکن حضرت علیؓ نے ان کی تکفیر نہیں کی۔ اس تعلق سے ایک شخص کے سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ وہ کفر سے ہی تو بھاگے ہیں (من الکفر فروا)۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پھر ان پر کیا حکم لگایا جائے تو انہوں نے فرمایا: ''اخواننا بغوا علینا'' (وہ ہمارے بھائی جو ہمارے خلاف باغی ہو گئے ہیں)[24]۔

اسلاف میں اس تعلق سے احتیاط کی روش پائی جاتی تھی۔ وہ حکمِ شرعی کا اطلاق فرد کی ظاہری حالت پر کرتے ہوئے باطن کی کیفیت کو خدا پر چھوڑنے کے قائل تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ ہم ظاہر حال پر حکم لگاتے ہیں اور چھپے ہوئے احوال کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں (نحن نحکم بالظواہر ونولی الی اللہ السرائر)۔ اس لیے جو لوگ دین کے اساسی اعتقادات پر ایمان لاتے ہوئے خود کو مسلمان کہتے تھے انھیں مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، خوارج، معتزلہ، جہمیہ یا قدریہ جیسی جماعتوں کے ضلال وانحراف کے اظہر

---

[23] القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۹۸۸، ج ۳، ص ۱۹۲

[24] ابوبکر عبدالرزاق بن الہمام: مصنف عبدالرزاق، جنوب افریقیا: المجلس العلمی، ج ۱۰، ص ۱۵۰

من الشمس ہو جانے اور ان سے اختلاف کے باوجود علمائے اہل سنت اس نکتے پر متفق رہے کہ ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اختلاف فکر و نظر کو اہمیت دی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اصول وآداب کے دائرے میں ہو اور تعمیری اور نتیجہ خیز ہو۔ اسلامی فکری روایت کی تشکیل میں ایک بنیادی عامل کے طور پر اس نوع کے اختلاف فکر و نظر کا اہم کردار رہا ہے جس کے اہم نمونے سلف صالحین کے طرز عمل میں ملتے ہیں۔ موجودہ دور میں فکر اسلامی کو مضبوط بنیادوں پر قائم و مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس حوالے سے اسلام کی اصولی تعلیمات اور اسلاف کے نقوش عمل کو بنیاد بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس تعلق سے اسلامی حلقہ ہائے علم وفکر کا موجودہ منظر نامہ قابل اطمینان نہیں ہے۔ اصحاب علم و دانش کے لیے یہ غور و فکر کا ایک اہم موضوع ہے۔

مطبوعات دارالمصنفین

تعلیم

اسلامی نظام تعلیم

از سید ریاست علی ندوی

مسلمان علمانے فن تعلیم پر جو کتابیں لکھی ہیں یا اپنی تحقیقات میں تعلیم سے متعلق جو نظریے بتائے ہیں یا متفرق خیالات ظاہر کیے ہیں یا بزرگوں کے تعلیمی واقعات و معاملات سے جو اصول آج سمجھے جا سکتے ہیں ان کو اس رسالہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسلامی نظام تعلیم کا آئینہ ہے جس میں اس بحث کا ہر پہلو نمایاں ہے۔

صفحات ۱۷۷/ قیمت ۹۰ روپے

اقلیتی حقوق

اسلام، مغرب اور ہندوستان کے تناظر میں

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

zik@zik.in

اسلام میں اقلیتی حقوق

موجودہ زمانے میں اقلیتی حقوق کے بارے میں بات کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخ میں اسلام وہ پہلا مذہب تھا جس نے قانوناً اور عملاً اقلیتوں کی حفاظت کے لئے اسٹیٹ کی ذمے داری بنائی اور اس کو قانونی شکل دی۔ اسلام سے پہلے یہ عام رواج تھا کہ لوگ بادشاہ کے دین کے تابع ہوتے تھے۔ جو دین بھی بادشاہ اپناتا تھا، رعایا اسی دین کو ماننے کے لئے مجبور ہوتی تھی اور جو لوگ نہیں مانتے تھے ان پر جبر و ستم روا رکھا جاتا تھا جیسے اسلام سے پہلے بیزنطینی عیسائی آرتھوڈاکس حکمرانوں نے مصر کے عیسائی قبطیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد ہی قبطی پہلی بار کھل کر اپنے مذہبی فرائض انجام دینے لگے ورنہ اسلام سے پہلے قبطی پوپ گاؤوں اور کھیتوں میں چھپا پھرتا تھا۔ عمرو بن العاص کے پروانۂ امان کے بعد ہی پوپ بنیامین الاول (۵۹۰-۶۶۱) نے اسکندریہ آکر اپنا منصب سنبھالا۔ اسلام سے پہلے مصر میں بیزنطیوں کے ڈر سے قبطی چرچ زمین دوز ہوتے تھے۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اقلیت تسلیم کیا، ان کو "اہل الکتاب" کہا اور ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ان کے مذہبی مقامات کو تحفظ فراہم کیا۔ صحتمند غیر مسلم مردوں سے جزیہ کے نام سے ایک ٹیکس لیا گیا جو کہ غیر مسلم مردوں کے مسلم فوج کے ساتھ لڑائی میں شرکت پر معاف ہو جاتا تھا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں پر کوئی ٹیکس نہیں تھا۔ جزیہ ٹیکس بہت معمولی تھا اور غریبوں، متوسط الحال اور مالدار لوگوں کے لئے الگ الگ شرح مقرر تھی[1]۔ یہ ٹیکس سال

---

[1] امیر وہ تھے جن کے پاس سال کے آخر میں دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ جمع ہوتے تھے۔ متوسط وہ تھے جن کے پاس ۲۰۰ سے چار ہزار درہم ہوتے اور غریب وہ تھا جس کے پاس ۲۰۰ درہم سے کم ہوتے۔ یوں امیر ذمی سے ۴۸ درہم، متوسط سے ۲۴ درہم اور غریب سے ۱۲ درہم سال میں لئے جاتے تھے (الجصاص، احکام القرآن، تحقیق عبدالسلام محمد علی شاہین، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

کے ختم ہونے پر ہی لیا جاتا تھا۔ ٹیکس کی شرح بہت معمولی ہوتی تھی جبکہ مسلم شہری کو زکات اور دوسرے مختلف ٹیکس دینے پڑتے تھے۔ شروع میں عیسائیوں، یہودیوں اور صابئہ کو ''اہل کتاب'' کہا گیا۔ اسلامی فتوحات کے بعد مجوسیوں اور ہندوستان کے بت پرستوں کو بھی، جنھیں اب ''ہندو'' کہا جاتا ہے، ''اہل کتاب'' میں شامل کر لیا گیا[2]۔ اس کے علاوہ بھی اسلام ریاست میں کئی اور غیر مسلم قومیں رہتی تھیں جیسے دروز اور یزیدی۔ ان سب کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

خلافت عثمانیہ نے، جو کئی سو سال تک قائم رہی اور جس نے عالم اسلام کے بہت بڑے علاقے پر حکومت کی، ایک ''ملت سسٹم'' بنایا تھا جس کے تحت سلطنت کے اندر رہنے والی غیر مسلم قومیں خود مختار تھیں، بلکہ اپنے علاقوں کے اندر ان کی اپنی عملداری چلتی تھی اور ان کے درمیان ہونے والے تنازعات کا فیصلہ ان کی اپنی عدالتیں کرتی تھیں۔ سنہ ۱۹۲۲ میں سلطنت عثمانیہ کے ٹوٹنے پر یہ نظام بکھر گیا اور نیا سیکولر نظام وجود میں آیا جس کے تحت سب لوگ برابر تھے لیکن یہ برابری بالعموم صرف کاغذ پر ہوتی ہے جبکہ سماج کا طاقتور یا اکثریتی طبقہ اپنے من مانے قوانین بناتا ہے اور ان کو اقلیتوں پر تھوپتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی قبضے کے بعد سے مسلمانوں کو عائلی امور کی حد تک اپنی شریعت پر عمل کرنے کا قانونی حق ہے۔ اس کو شریعت ایکٹ ۱۹۳۸ کے ذریعے قانونی شکل دی گئی۔ آزاد ہندوستان میں بھی یہ قانون باقی ہے لیکن اس کی مستقل خلاف ورزی ہوتی ہے اور وقتاً فوقتاً کامن سول کوڈ کا نعرہ لگایا جاتا ہے جس کے تحت یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ بغیر ایک مشترک شہری قانون کے ہندوستان کے لوگ ایک قومی دھارے میں نہیں جڑ سکتے ہیں۔ یہ منطق غلط ہے لیکن فی الحال یہ جگہ اس پر بحث کی نہیں ہے۔

یورپ میں اقلیتی حقوق کا مسئلہ

''اقلیتی حقوق'' کا مسئلہ ایک خالص یوروپین مسئلہ ہے کیونکہ یورپ کے مختلف ملکوں میں رہنے والی مذہبی اور

ط: ۳، ۲۰۰۷، ۳/۷ ۱۲)۔ آج کی قیمت کے لحاظ سے یہ رقم بالترتیب ۱۰۵۱۰ ہندوستانی روپئے، ۳۸۰۵ روپئے اور ۱۹۰۲ روپئے ہے۔ یاد رہے کہ مسلمان کے لئے زکات کا نصاب ۲۰۰ درہم ہے۔

[2] ہندوستان کے بت پرستوں کو ''اہل کتاب'' ماننے کے بارے میں دیکھئے: چچنامہ *The Chachnamah*، فارسی سے انگریزی ترجمہ: میرزا قلیچ بیگ فریدون بیگ، کراچی ۱۹۰۰ء، ص ۱۰۸۔

قومی اقلیتوں کو مقامی اکثریتیں بہت پریشان کرتی تھیں۔ یہودی اس کا بالخصوص شکار تھے اور عصورِ وسطی میں ان پر حضرت مسیح کے قاتل ہونے، سودی کاروبار کرنے، عیدالفصح Passover میں غیر یہودی بچوں کو اغوا کرکے ان کے خون سے روٹی بنانے کے الزام میں بہت ظلم ہوتا تھا بلکہ اکثر قتل عام کے بعد ان کو مختلف ملکوں سے نکال دیا جاتا تھا اور بالآخر ان کو صرف سلطنت عثمانیہ میں پناہ ملتی تھی۔ صدیوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی لئے مراکش سے لے کر تونس، لیبیا، مصر، ترکی، عراق، شام وغیرہ میں کافی بڑی یہودی آبادیاں بس گئیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ سنہ ۱۹۴۸ میں اسرائیل بننے کے بعد وہاں چلے گئے۔ بغداد کے یہودی بہت مالدار تھے اور ملک کے اندر اور باہر تجارت پر ان کا کافی قبضہ تھا۔ بغداد کے یہودی اسرائیل نہیں جانا چاہتے تھے، اس لئے اسرائیلی ایجنٹوں نے وہاں یہودی عبادت گاہوں (کنیس) اور یہودی گھروں پر بموں سے حملے کئے اور الزام مسلمانوں پر لگا دیا۔ یوں بغدادی یہودی اسرائیل جانے کے لئے تیار ہوئے۔ برسوں بعد اس کا راز کھلا۔ اس کو لاوون اسکینڈل Lavon Affair کہا جاتا ہے۔ مصر میں بھی یہودیوں کا تجارت پر بڑا قبضہ تھا۔ میں نے خود وہاں ۱۹۶۶۔۱۹۷۳ میں بطور طالبعلم قیام کے دوران شیکوریل، داؤد عدس، عمر افندی، صید ناوی، بنزایون وغیرہ کے نام کی بہت بڑی بڑی لق ودق دکانیں دیکھی ہیں۔ ہر دکان کی بہت سی برانچیں تھیں۔ یہ دکانیں شاید اب بھی اسی پرانے نام سے مصر میں قائم ہوں گی۔

اقلیتی حقوق بین الاقوامی قانون میں

یورپ میں پہلی جنگ عظیم تک مختلف قوموں کے علاقے، مثلاً پولینڈ اور جرمنی کے کچھ علاقے، پڑوسی ملکوں کے قبضے میں تھے جیسے روس، آسٹریا اور پروشیا جہاں ان قومی اور لسانی اقلیتوں کے ساتھ کافی زیادتی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اقلیتوں کا مسئلہ پہلی بار ویینا کانگریس میں سنہ ۱۸۱۴ میں اٹھایا گیا جہاں یورپ کے اکثر ممالک کی اعلی ترین نمائندگی تھی۔ اس کانفرنس میں بالخصوص جرمن یہودیوں اور پولینڈ کی اقلیت کا مسئلہ اٹھایا گیا جو روس اور جرمنی کے ماتحت علاقوں میں تھی۔ اس کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا اور ان کو تحفظ دیا جائے گا۔ لیکن عملاً اس پر عمل نہیں ہوا۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۵۶ میں منعقد ہونے والی پیرس کانگریس میں دوبارہ اس مسئلے پر بحث ہوئی اور خصوصی طور سے سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے یہودی اور عیسائیوں کے حقوق کی بات کی گئی۔ برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ پر الزام لگایا کہ اس نے بلغاریہ میں عیسائیوں کا قتل عام کیا ہے۔

سنہ ۱۸۷۴ میں منعقد ہونے والے برلین کانگریس میں یہ مسئلہ دوبارہ اٹھا اور خاص طور سے رومانیا، سربیا

اور بلغاریا میں مقیم یہودیوں کے حقوق پر بحث ہوئی۔ اس عرصے میں روس ہیں بسنے والے یہودیوں نے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف کافی احتجاج کیا۔ اسی زمانے میں جنوبی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بسنے والے کالے لوگوں پر جو مظالم ہو رہے تھے لیکن ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اسی عرصے میں یورپ کے مختلف ممالک سلطنت عثمانیہ میں اقلیتوں کے حامی بنے پھرتے تھے جیسے روس سلطنت عثمانیہ میں بسنے والے آرتھوڈکس عیسائیوں اور سلاوی نسل کے لوگوں کی حفاظت وحمایت کا دعوی کرتا تھا اور اس بہانے سلطنت عثمانیہ کے مسائل میں دخل انداز ہوتا تھا۔ شام میں، فرانس مارونی عیسائیوں کی تایید کرتا تھا جبکہ برطانیہ دروز کی حمایت کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں یوروپین طاقتوں نے بالعموم ''اقلیتی حقوق'' کو سلطنت عثمانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہم پائیں گے کہ مغربی ممالک ''اقلیتی حقوق'' کو ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جبکہ خود ان ممالک کا ''حقوق انسانی'' کے تئیں اپنے ملکوں کے باہر ریکارڈ بہت خراب ہے جیسے امریکا کا افغانستان اور عراق میں۔

یورپ کی تاریخ میں پہلی بار حقوق انسانی کی حفاظت کا قانون ہنگری نے جولائی ۱۸۴۹ میں بنایا۔ آسٹریا نے بھی سنہ ۱۸۶۷ میں اس طرح کا قانون بنایا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد منعقد ہونے والی پیرس پیس کانفرنس سنہ ۱۹۱۹ میں اقلیتی حقوق کا مسئلہ اٹھایا گیا بالخصوص پولینڈ میں رہنے والے جرمن اور جرمنی میں رہنے والے پولش لوگوں کا مسئلہ زیر بحث آیا، لیکن اس مسئلے پر کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ البتہ اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ اس کانفرنس میں اقلیتی حقوق کی حفاظت کے لئے ایک معاہدہ تیار کیا گیا اور یہ شرط لگادی گئی کہ کوئی نیا ملک جو مذکورہ پیس کانفرنس میں شریک ہونا چاہتا ہے، اسے اس معاہدے پر دستخط کرنا ہوگا۔ اس طرح اقلیتی حقوق پہلی بار بین الاقوامی قانون کا حصہ بن گیا اور تمام ممالک پر اس کا احترام لازم ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۹ آتے آتے لیگ آف نیشنز نے دم توڑ دیا جبکہ اس کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان ۱۹۴۶ میں ہوا۔ اس وقت یورپ کے بعض بڑے ممالک کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو جلد ہی دوسری عالمی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر فاتح قوموں نے اکتوبر ۱۹۴۵ میں ''اقوام متحدہ'' کے نام سے نئی تنظیم

بنائی لیکن اس میں لیگ آف نیشنز کے تحت جن امور پر پہلے اتفاق ہو گیا تھا، ان کو باقی رکھا گیا۔ ان امور میں اقلیتی حقوق بھی شامل تھے۔ یہ مبادی اقوام متحدہ کے میثاق (چارٹر) کا حصہ بن گئے۔ دھیرے دھیرے ان قوانین میں مزید وضاحت آنے لگی اور بچوں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، پناہ گزینوں کے حقوق اور اقلیتوں کے حقوق پر بین الاقوامی معاہدے وجود میں آئے، جن پر اقوام متحدہ کے ہر نئے ممبر کا دستخط کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

اقلیتوں کی حفاظت کے لئے جو سب سے اہم قانون بنا وہ قتل عام کو روکنے اور اس کی سزا دینے کے لئے اقوام متحدہ کا کنونشن تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۴۸ میں بنا اور اس کا نام ہے: UN Convention on the Prevention and Punishment of the Crime of Genocide۔

اس کے بعد متعدد بینالاقوامی قوانین بنے جو کمزوروں اور بالخصوص اقلیتوں کی حفاظت کرتے ہیں، مثلاً:

—بین الاقوامی میثاق برائے شہری اور سیاسی حقوق (دسمبر ۱۹۶۶) International Covenant on Civil & Political Rights۔

—اقوام متحدہ کا اعلان برائے قومی، نسلی، لسانی اور مذہبی اقلیات (فروری ۱۹۹۲) UN Declaration on the Rights of Persons Belonging to the National or Ethnic, Religious and Linguistic Minorities۔

اس کے علاوہ کاؤنسل آف یورپ نے (جسے اب یوروپین یونین کہا جاتا ہے) قومی اقلیتوں اور مقامی یا اقلیتی زبانوں کے تحفظ کے لئے دو قانون پاس کئے۔

ان معاہدوں کے تحت اقلیتوں کے وجود، تفریق اور ایذارسانی سے تحفظ، تشخص کی ضمانت، اور سیاسی زندگی میں شرکت کا حق دیا گیا ہے۔ معذوروں اور LGBT یعنی مخنث لوگوں کو بھی تحفظ دیا گیا۔

شروع میں اقوام متحدہ نے مقامی اصلی آبادیوں کو اقلیت کی کٹیگری میں رکھا تھا لیکن بعد میں ان کے لئے ایک الگ بین الاقوامی قانون بنایا گیا جو انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کا کنونشن ۱۶۹ اور اقوام متحدہ کا اعلان برائے مقامی اصلی آبادیوں کے حقوق UN Declaration on the Rights of Indigenous People کی شکل میں ہے۔ اس کو ستمبر ۲۰۰۷ میں پاس کیا گیا۔

اقلیتی حقوق کے ملکی قوانین

ان بین الاقوامی قوانین کے اثر سے بہت سے ممالک نے اقلیتوں کی حفاظت کے لئے مقامی قوانین اور ایسے ادارے بنائے جو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں، جیسے ہنگری کا پارلیمانی کمشنر برائے قومی ولسانی اقلیتی حقوق Parliamentary Commissioner for National and Ethnic Minority Rights جسے سنہ ۱۹۵۵ میں بنایا گیا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی سنہ ۱۹۹۲ میں قومی اقلیتی کمیشن اسی غرض سے بنااور اس کمیشن کا ایکٹ ایک طرح سے اقلیتی حقوق کا قانون ہے۔اس کے تحت حکومت نے پانچ اقلیتوں کو مذہبی اقلیت کے طور سے تسلیم کیا جو یہ ہیں: مسلمان، سکھ، بدھسٹ، عیسائی اور پارسی۔ بعد میں سنہ ۲۰۱۴ میں جین قوم کو بھی اقلیت تسلیم کر لیا گیا۔

اگلے کچھ سالوں میں ہمارے اکثر صوبوں میں بھی اقلیتی کمیشن بنائے گئے۔ سنہ ۲۰۰۴ میں مرکزی حکومت نے اقلیتی تعلیمی اداروں کے لئے بھی ایک کمیشن National Commission for Minority Educational Institutions کے نام سے بنایا جس کا مقصد اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کی مدد اور بالخصوص ان کو اعتراف نامہ دینا تھا کہ وہ اقلیتی ادارے ہیں، جس کے بعد وہ اپنے کچھ حقوق کا استعمال کر سکتے ہیں مثلاً اپنے ادارے میں ۵۰ فیصد اقلیتی طلبہ کا داخلہ۔ اگرچہ شروع میں اس کمیشن نے جسٹس سہیل صدیقی کی سربراہی میں بہت تیزی سے عمدہ کام کئے، لیکن موجودہ سرکار کے آنے کے بعد اس کا ایسا چیئرمین بنایا گیا ہے جو کام نہ کرنے پر یقین رکھتا ہے اور تقریباً یہی حالت آجکل مرکزی اور صوبائی اقلیتی کمیشنوں کی بھی ہے۔

سنہ ۲۰۰۶ میں سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد مرکزی سرکار نے کئی اسکیمیں بنائیں، بالخصوص مسلم اقلیت کے لئے اسکالر شپس کا اجرا کیا اور دینی مدارس کی تجدید کا پروگرام بنایا۔ اگرچہ یہ اسکیمیں اب بھی کاغذ پر موجود ہیں لیکن ایک تو ہر سال ان کے بجٹ میں کٹوتی کی جارہی ہے، دوسرے جو بجٹ منظور ہوتا ہے اس کو بھی پورا خرچ نہیں کیا جاتا، مثلاً سنہ ۲۰۱۹ میں اقلیتوں کے لئے مختص بجٹ کا صرف ۳۰ فیصد خرچ کیا گیا۔ اس کے علاوہ موجودہ حکومت نے مسلم اقلیت کے لئے بنائی گئی اسکیموں کو تمام اقلیتوں کے لئے عام کر دیا جس کی وجہ سے مسلمان بچوں کو پہلے کے مقابلے اور بھی کم اسکالر شپس ملنے لگیں۔ صوبائی حکومتوں کے تحت بھی یہی

صورتحال ہے۔ دہلی میں مشکل سے ۶-۷ ہزار اقلیتی اسکولی بچوں کو اسکالرشپس ملتی ہیں، جس میں تمام اقلیتیں شامل ہیں۔اسی طرح دہلی کے اقلیتی مالیاتی ادارہ نے، جس کے چلانے پر تین سال قبل ۱۸ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا تھا، اقلیتوں کو مشکل سے چند لاکھ روپئے سال بھر میں قرض دئے۔اس کی تفصیلات میری صدارت کے دوران جاری ہونے والی دہلی اقلیتی کمیشن کی سالانہ رپورٹوں میں موجود ہیں۔ اقلیتوں کے بارے میں وزیراعظم کا ۱۵ نکاتی پروگرام اندرا گاندھی کے زمانے سے بنا ہوا ہے لیکن وہ صرف کتابوں اور وزارت اقلیتی امور کی ویب سائیٹ کی زینت ہے۔

ہندوستانی قانون میں اقلیتی حقوق

ہندوستانی آئین کے تحت اقلیتوں کو وہ تمام حقوق ملے ہوئے ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کو کچھ مزید حقوق ملے ہیں۔ سب پر اطلاق ہونے والے قوانین کو مشترک دائرہ Common Domain اور صرف اقلیتوں کو مراعات دینے والے قوانین کو الگ دائرہ Separate Domain کہا جاتا ہے۔ کامن ڈومین کے تحت آئین کے مقدمے Preamble میں ہی گارنٹی دی گئی ہے کہ ہر ہندوستانی کو سوچنے، بولنے نیز مذہبی عبادت کرنے کی آزادی ہے اور ہر ہندوستانی کو یکساں حیثیت اور مواقع حاصل ہیں۔

الگ دائرے کے ضمن میں آرٹیکل (1)29 آتا ہے جس کے تحت ہر شہری کو اپنی زبان، رسم الخط اور کلچر کا تحفظ دیا گیا ہے۔ آرٹیکل (2)29 میں تمام حکومتی اور حکومتی امداد یافتہ تعلیمی اداروں میں ہر شہری کو یکساں مواقع کی گارنٹی دی گئی ہے۔ آرٹیکل (2)30 میں تمام اقلیتی تعلیمی اداروں کو حکومتی امداد حاصل کرنے کے یکساں حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ آرٹیکل (A)350 کے تحت ہر شہری کو اس کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ آرٹیکل (B)350 کے تحت لسانی اقلیتوں کے لئے ایک خصوصی افسر کو تعینات کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آرٹیکل 25 کے تحت سکھوں کو کرپان رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔

آئین کے آرٹیکل ۲۹ کے تحت مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے بنانے کا حق دیا گیا ہے۔ یوں تمام چھ مذہبی اقلیتوں اور ہندوستان کی ۲۰ تسلیم شدہ زبانوں کے بولنے والے جہاں بھی اقلیت میں ہوں یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے تعلیمی ادارے بنائیں اور ان میں اپنے مذہب، زبان اور کلچر کی خصوصی تعلیم دیں۔ آئین کے آرٹیکل ۲۹ کے تحت نسل race، مذہب، ذات caste اور زبان کی بنیاد پر حکومتی یا حکومتی مدد سے چلنے

والے تعلیمی اداروں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہو سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے یا حکومت کی مدد سے چلنے والے تمام تعلیمی ادارے تمام ہندوستانیوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔آئین کا آرٹیکل ۱۶،اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ حکومتی ملازمتوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جائے گا بلکہ تمام ہندوستانی یکساں مواقع کے مالک ہوں گے۔

آئین کا آرٹیکل ۲۵،اس بات کی گارنٹی دیتا ہے کہ ہر ہندوستانی کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔اس کے تحت ہر ہندوستانی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا پورا حق ہے، لیکن اس کی یہ حد مقرر کی گئی ہے کہ اس حق سے عوام کا امن وسکون درہم برہم نہ ہو۔یہی نہیں بلکہ مذہبی اقلیتوں کو اپنے مذہب کا پرچار کرنے کی بھی پوری آزادی حاصل ہے لیکن حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ مذہب کی تبدیلی میں کوئی لالچ یا طاقت کا استعمال نہیں ہوگا۔اس واضح آئینی صورتحال کے باوجود ہندوستان کے بہت سے صوبے تبدیلیٔ مذہب کے خلاف قانون بنا چکے ہیں جو ہندوستانی آئین سے متصادم ہیں۔ تبدیلیٔ مذہب کرانے کے الزام میں سینکڑوں لوگ اس وقت گرفتار ہیں۔اس کے برعکس ہندو گروپ کھلے عام طرح طرح سے لالچ دے کر مسلمانوں اور عیسائیوں کو ''گھر واپسی'' کی دعوت دے رہے ہیں اور کہیں کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔اس ظلم کے خلاف مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو سپریم کورٹ سے رجوع کرنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی حقوق سے وہی اقلیتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو بذات خود مضبوط ہوں جیسے اس زمانے میں امریکہ اور مغربی یورپ کے یہودی ہیں یا ہمارے ملک میں سکھ،عیسائی اور جین اقلیتیں ہیں جو اپنے حقوق کا خوب فائدہ اٹھاتی ہیں۔جو اقلیت جتنی کمزور ہوگی اتنی ہی وہ حقوق سے محروم رہے گی جیسے ہندوستان میں بدھسٹ اور مسلمان۔

اخبار علمیہ

ہسٹری آف ٹیپو سلطان کا ایک اقتباس

ہسٹری آف ٹیپو سلطان، محب الحسن خاں مرحوم سابق لکچرر شعبۂ اسلامی تاریخ و تمدن، کلکتہ یونیورسٹی کی مشہور انگریزی تصنیف ہے۔ یہ ۱۹۵۱ء میں Bibliophile، سی دت، آرٹ پریس ۲۰ برٹش انڈیا اسٹریٹ، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس میں کل ۴۳۴ صفحات ہیں۔ جب یہ منظر عام پر آئی تو سابق ناظم دارالمصنفین سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اس پر معارف مارچ ۱۹۵۳ء میں باب التقریظ والانتقاد کے تحت لکھا تھا کہ لائق مصنف نے بڑی تحقیق و جستجو سے ٹیپو کی زندگی کے ہر پہلو کا تجزیہ کیا ہے۔ فارسی، انگریزی اور اردو دستاویزات کے ساتھ ساتھ اس میں انہوں نے فرانسیسی، ولندیزی، پرتگالی، تامل، تلگو اور کنڑی ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے تبصرہ میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر مصنف کی اجازت ہو تو اس کے خاص خاص حصوں کے ترجمے اور اقتباسات قارئین معارف کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ گزشتہ دنوں اتفاق سے اس کتاب پر نظر پڑی۔ اس کا اکیسواں باب ٹیپو کی ''ریلیجیس پالیسی'' کے عنوان سے ص ۳۵۴ سے ۳۶۳ تک تقریباً دس صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں اسی مناسبت سے اس کے ایک اقتباس کا ترجمہ اس مقصد سے پیش کیا جارہا ہے کہ شیر میسور کی مذہبی پالیسی اور اس کی رواداری کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اس کا رد سامنے آئے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ حیدر علی نے اپنی ریاست میں ہندوؤں کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ٹیپو نے بھی اپنے والد کی اس پالیسی کو جاری رکھا۔ پرنیا کو میر آصف (ریوینیو کمشنر) کے اہم منصب پر اور کرشنا راؤ کو افسر خزانہ کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ شمیا آئینگر ڈاک اور پولیس کا وزیر تھا۔ اس کے بھائی نرسنگا راؤ کے پاس بھی سرنگا پٹنم میں متعدد اہم مناصب تھے۔ سری نواس راؤ اور اپاجی رام ٹیپو کے معتمد خصوصی تھے جنہیں اہم سفارتوں پر بھیجا جاتا تھا۔ مولچند اور سوجان رائے مغل دربار میں اس کے وکیل تھے۔ سبا راؤ اس کا خصوصی پیش کار تھا۔ اس کا ایک منشی نرسئیا بھی ہندو تھا۔ کورگ کا فوجدار ایک برہمن کو مقرر کیا تھا۔ مالیبار کے جنگل کاٹنے کا ٹھیکہ بلا شرکت غیرے ایک برہمن کو دیا تھا۔ ایک برہمن کو کوئمبٹور کا میر آصف مقرر کیا تھا۔ پھر یہی منصب اسے پال گھاٹ میں دیا گیا تھا۔ ٹیپو کے بہت سے عامل اور مال کے افسر ہندو تھے۔ فوج میں بھی ہندوؤں کو اہم عہدے دیے گئے تھے۔ ہری سنگھ باقاعدہ سواروں کا رسالہ دار تھا۔ نائروں کی بغاوت کچلنے کے لیے روش خاں کے ساتھ سری پت راؤ کو بھی متعین کیا گیا تھا۔ سیوا جی جو مرہٹہ تھا اس کے ساتھ تین ہزار کی کمان تھی اور ۱۷۹۱ء میں بنگلور کے محاصرہ کے وقت وہ بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ راما راؤ نامی برہمن بھی سواروں کا کمانڈر تھا۔ (ص ۳۵۴-۳۵۵) اس سے ٹیپو

سلطان کی مذہبی رواداری، فرقہ واریت سے بیزاری اور نفور کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس اہم کتاب کا اردو ترجمہ حامد اللہ افسر اور عتیق احمد صدیقی نے مشترکہ طور پر کیا جو پہلی بار ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو، حکومت ہند نے اس کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں شائع کیا ہے۔ درج بالا اقتباس کے ترجمہ کے وقت یہ اردو ترجمہ بھی پیش نظر رہا ہے۔

بھارتی قانون سازی میں خواتین کی شمولیت

۲۶؍ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندستان میں قانون نافذ ہوا لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ملک کی مجلس قانون ساز نے ۲۶؍ نومبر ۱۹۴۹ء ہی کو اس کو منظور کر لیا تھا۔ اسی لیے ملک میں غالباً ۲۶؍ نومبر کی تاریخ کو "یوم قانون" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مجلس قانو ساز میں تین سو نواسی اساسی ارکان تھے۔ جن میں ہندوستان کی کل ۱۵؍ نمایاں ترین خواتین بھی شامل تھیں۔ انہوں نے مسودۂ قانون تیار کرنے میں اہم کردار نبھایا تھا۔ ایک ہندی روزنامہ نے "یوم قانون" کے موقع کی مناسبت سے مجلس قانون ساز میں شامل ان خواتین کی فہرست شائع کی ہے۔ اس قسم کی معلومات بالعموم عام لوگوں کی دسترس میں کم آپاتی ہیں۔ قارئین معارف کی دلچسپی کے پیش نظر وہ فہرست یہاں درج کی جاتی ہے تاکہ ان کے نام صفحات معارف میں بھی محفوظ ہو جائیں۔ یہ ہندی میں ہیں۔ ہم نے اس کو اردو میں کیا ہے۔ ۱۔ امو سوامی ناتھن۔ ۲۲/اپریل ۱۸۹۴ء میں کیرلہ میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۶ء میں مجلس قانون ساز کی رکن منتخب ہوئیں۔ ۲۔ بیگم اعجاز رسول۔ ۲؍ اپریل ۱۹۰۹ء کو مالیر کوٹلہ کے ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ مجلس قانون ساز میں شامل یہ واحد مسلم خاتون ہیں۔ ۳۔ درگا بائی دیشمکھ۔ ۱۵؍ جولائی ۱۹۰۹ء میں راج منڈری، آندھرا پردیس میں پیدا ہوئیں۔ ۱۲؍ سال کی عمر میں عدم تعاون تحریک میں شامل ہوئیں۔ ۴۔ کملا چودھری۔ ۲۲؍ فروری کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ پڑھائی جاری رکھنے کے لیے بڑی جد وجہد کی۔ اکھل بھارتیہ کانگریس کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ ۵۔ ہنسا جیو راج مہتا۔ ۳۰؍ جولائی ۱۸۹۷ء بڑودہ میں پیدا ہوئیں۔ سماجی علوم اور صحافت کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں اکھل بھارتیہ مہیلا سمیلن کی صدر منتخب ہوئیں۔ ۶۔ رینکارے۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے بی اے کیا۔ مغربی بنگال میں اکھل مہیلا سنگھ اور دوسری خواتین تنظیموں کی بنیاد ڈالی۔ ۷۔ سروجنی نائیڈو۔ ۳۰؍ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ تحریک آزادی کے لیے خود وقف کر دیا تھا اور آزاد ہندوستان میں ہندوستان کی پہلی خاتون گورنر منتخب ہوئیں۔ دارالمصنّفین بھی تشریف لائیں۔ ۸۔ سچیتا کرپلانی۔ ۱۹۰۸ء میں انبالہ پیدا ہوئیں۔ بھارت چھوڑو آندولن میں اہم کردار ادا کیا۔ ملک کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ ہونے کا اعزاز ان کو حاصل ہے۔ ۱۹۶۵ء میں دارالمصنّفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر یہاں تشریف لائیں۔ ۹۔ راج کماری امرت

کور۔ ۲؍ فروری ۱۸۸۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ملک کی پہلی خاتون وزیر صحت بنیں۔ ۱۰۔ لیلا رائے۔ ۲؍ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو آسام کے گولپاڑہ میں پیدا ہوئیں۔ عورتوں کے حق رائے دہی اور ان کے اس قسم کے دوسرے حقوق واختیارات کے لیے بڑی کدوکاوش کی۔ ۱۱۔ وجے لکشمی پنڈت۔ ۱۸؍ اگست ۱۹۰۰ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم کی بہن تھیں۔ یہ پہلی خاتون کابینی وزیر کے منصب پر فائز ہوئیں۔ ۱۲۔ پورنیما بنرجی۔ کسانوں، مزدوروں اور دیہی افراد کے حقوق کی آواز بلند کرنے والی خاتون قائد کے طور پر مشہور ہوئیں۔ ستیہ گرہ اور بھارت چھوڑو آندلن سے وابستگی کے سبب جیل بھی گئیں۔ ۱۳۔ اینی مسکرینی۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے سبب متعدد دفعہ جیل بھی گئیں۔ کیرالہ سے منتخب ہونے والی پہلی خاتون ممبر آف پارلیمنٹ تھیں۔ ۱۴۔ دکچھاینی ولایودھن۔ ۴؍ جولائی ۱۹۱۲ء کو کوچی میں پیدا ہوئیں۔ مجلس قانون ساز میں شڈول کاسٹ سے صرف یہی ایک خاتون رکن تھیں۔ ۱۵۔ مالتی چودھری۔ ۱۹۰۴ء میں پوربی بنگال (اب بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے بڑے علم برداروں میں ہوتا ہے۔ (ہندوستان، وارانسی۔ ہندی روزنامہ۔ ۲۶/۱۱/۲۱ء ص ۱۶)

افغانی یتیموں کے لیے موبائل لائبریری کی سہولت

ایک عالمی خبر رساں ادارے کے مطابق امارات اسلامیہ، افغانستان کی وزارت تعلیم کی جانب سے یتیم خانوں میں دوبارہ موبائل لائبریری کی سہولت واجازت فراہم کی گئی ہے۔ کابل میں ایک یتیم خانہ کے بچوں کے چہرے اس وقت کھل اٹھے جب ایک موبائل لائبریری نے انہیں پورے دن اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھنے کا موقع دیا۔ یہ موبائل لائبریری ان پانچ بسوں میں سے ایک ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک تعلیم یافتہ افغان خاتون فرشتہ کریم کی قائم کردہ غیر سرکاری تنظیم کی ملکیت ہے۔ تنظیم کے سربراہ احمد فہیم برکاتی نے بتایا کہ طالبان کے اقتدار میں آتے ہی تمام اسپانسرز ختم ہو گئے تھے اور اخراجات پورے کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن اب اجازت سے دوبارہ اسپانسرز بھی مل گئے اور ذرائع نقل وحمل سے معاہدہ بھی طے پاگیا ہے۔ واضح رہے کہ کابل کی تعلیم گاہوں میں لائبریری نہ ہونے کے سبب طلبہ کی اکثریت موبائل لائبریری سے ہی استفادہ کرتی تھی۔ (انقلاب، وارانسی ۷/دسمبر ۲۱ء ص ۱۲)

آبادی میں کمی کے متعلق ایک چشم کشا رپورٹ

دنیا کی آبادی کے متعلق ایک تازہ اور چشم کشا رپورٹ کے تناظر میں روزنامہ پندار کے اداریے میں جن خیالات کا

اظہار کیا گیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلخیص یہاں پیش کردی جائے۔اداریے کے مطابق ہندوستان سمیت پوری دنیا کی آبادی میں کمی کی توقع کی جارہی ہے ۔رواں دہائی میں ہی اس میں کمی ہونے کے آثار ہیں۔ہندوستان سمیت چین ،جاپان ،پاکستان ،بنگلہ دیش اور خلیجی ممالک میں آبادی میں غیر متوقع کمی آسکتی ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی کل آبادی سات اعشاریہ آٹھ ارب ہے۔۲۰۶۴ءتک اس میں اضافہ ہوگا اور یہ بڑھ کر نو اعشاریہ سات ارب ہو جائے گی۔لیکن اس کے بعد یہ گھٹ کر آٹھ اعشاریہ انیاسی ارب ہو جائے گی۔آج سے ۵۳؍ برس بعد دنیا کی آبادی عروج پر ہوگی، لیکن پھر شرح پیدائش میں کمی اور آبادی کے بڑے حصے کے کمزور و ناتواں ہونے کے سبب اس کا گراف گرنے لگے گا۔کم سے کم ۲۳؍ ممالک میں ۵۰؍ فیصد تک کمی آسکتی ہے۔۲۰۱۷ء میں چین کی آبادی ایک اعشاریہ چار ارب تھی لیکن ۲۱۰۰ءتک تقریباً آدھی کم ہو کر ۷۳ اعشاریہ دو کروڑ ہو جائے گی۔رپورٹ میں بعض ممالک مثلاً شمالی افریقہ وغیرہ کی آبادی میں اضافہ کی بات بھی کہی گئی ہے۔ہندوستان میں فی الحال ایک ارب تیس کروڑ کے قریب آبادی ہے جو ۲۱۰۰ءتک گھٹ کر ایک ارب نو کروڑ ہو جائے گی لیکن اس آبادی میں ممکنہ گراوٹ میں کم از کم ۸۰؍ برس لگیں گے۔(پندار، پٹنہ ۱۰؍ دسمبر ۲۱ءص۶)

امریکہ میں جمہوریت پر آن لائن کانفرس

کچھ دنوں قبل چین نے ’’انٹرنیشنل فورم آن ڈیموکریسی‘‘ کے موضوع پر ایک آن لائن اجلاس منعقد کیا تھا۔اس ورچوئل اجلاس میں ۱۲۰؍ ممالک کے اسکالرز اور رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔اس کے بعد امریکہ نے دو روزہ ورچوئل کانفرنس ’’سمٹ فار ڈیموکریسی‘‘ کے نام سے منعقد کی۔اس کانفرنس کے آغاز پر صدر امریکہ جو بائیڈن نے کہا کہ جمہوریت حادثاتی طور پر نہیں پنپتی ہے۔ہمیں آنے والی نسلوں کے لئے اس کی تجدید کرنا ہوگی۔انہوں نے عالمی سطح پر جمہوری اقدار میں انحطاط کے متعلق کہا کہ فی الوقت بین الاقوامی رجحانات بڑی حد تک غلط سمت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔اگلی دہائی میں دنیا کی سمت کا تعین کرنے کے لئے یہ ایک اہم لمحہ ہے۔جمہوری اقدار کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی کوششوں کو دوگنی کرنے کی ضرورت ہے ۔انھوں نے جمہوری صورت حال پر منڈ لانے والے خطرے کو ’’ہمارے وقت کا اہم چیلنج‘‘ بتایا اور وعدہ کیا کہ امریکہ جمہوری قدروں کے فروغ کے لیے ۴۲۴؍ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا۔ چینی کمیونسٹ پارٹی نے اس پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ دوسرے ممالک کو مغربی جمہوری نمونے کی نقل کرنے پر مجبور کرنے کی امریکی کوشش مکمل طور ناکام ثابت ہو گی۔(منصف، حیدرآباد، ۱۱؍ دسمبر ۲۱ءص۷)

کلیم صفات اصلاحی

تبصرۂ کتب

علمائے فرنگی محل (آثار الاُوَل من علماء فرنگی محل): از مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی، ترجمہ، تدوین، تحشیہ ڈاکٹر خوشتر نورانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۷۴، قیمت ۴۰۰ روپئے، پتہ: مکتبہ جام نور، ۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی، موبائل 9958093786، ایمیل: k_noorani@yahoo.com سنہ اشاعت: ۲۰۲۰ء

اصل عربی کتاب بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کی پہلی اشاعت کے متعلق فاضل مترجم کا خیال ہے کہ یہ ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ گویا اس کی عمر ایک سو پندرہ سال ہے، لیکن دوبارہ شائع نہ ہونے کی وجہ سے یہ نایاب ہی سمجھی گئی۔ ایک نہایت علمی خاندان کی تین سو برسوں کی مستند ترین اور جامع ترین تاریخ سے طباعت و اشاعت کی گرم بازاری میں یہ سرد مہری واقعی افسوس کی بات تھی۔ بقول مترجم "فرنگی محل داستان پارینہ بنتا گیا اور بر صغیر کے کتابی بازار میں اس داستان کی نایابی ایک مجرمانہ غفلت ہی تصور کی گئی"۔

پیش نظر کتاب اسی غفلت کا نہایت شاندار ازالہ ہے جس میں اصل عربی متن، اردو ترجمہ، حواشی و تعلیقات تعارف کتب مصادر، وضاحتی اشاریہ اور آخر میں کتابیات جیسے ابواب نے ضخم و حجم ہی کو وزن نہیں بخشا، کتاب کو ایسی زینت بخشی جو واقعی شایان شان ہے، فاضل مرتب، ترتیب و تدوین و تبویب کے جدید اصول سے بخوبی واقف ہیں اور اس کا اظہار ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔ فہرست ہو یا شروع میں ملاحظات ہوں سب میں تالیفی سلیقہ داد طلب ہے۔ کتاب کا اصل نام آثار الاول من علماء فرنگی محل ہے، مرتب کی نظر میں موجودہ عہد میں اس نام کی تفہیم اور ادائیگی آسان نہیں ہے، اس لئے نام کے آخری حصہ ہی کو اردو ترجمہ کا نام یعنی علمائے فرنگی محل دیا گیا۔ اصل عربی کتاب میں متن میں خاصی غلطیاں تھیں۔ اس زمانہ کی روش کے مطابق کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ کے تحت ان کی نشان دہی کر دی گئی تھی، اب محقق و مرتب نے اصل عبارت ہی میں یہ تصحیح شدہ الفاظ شامل کر دیئے جس سے اغلاط نامہ کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی طرح جو اور اضافے ہیں، ان کی افادیت نے کتاب کی اہمیت دوچند کر دی۔ حواشی و تعلیقات بجائے خود ایک نئے تذکرہ کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کی کثرت کی وجہ سے نہایت سلیقہ سے ان کو ایک جدا باب کی صورت دے دی گئی، ایک اور مفید کوشش یہ بھی ہے کہ شخصیات کے ذیل میں جن کتابوں اور تذکروں کا ذکر ہے، ان کا الگ ذکر

اس طرح ہے کہ محققین کے لئے ان مآخذ تک رسائی آسان تر ہو جائے۔ اظہار یہ کے عنوان سے خاندان فرنگی محل کا تعارف علامہ شبلی کی ایک تاریخی تحریر کے حوالہ سے یوں کیا گیا کہ جنوب ایشیا میں کوئی بھی خاندان سلسلہ درس، تعداد علماء اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے فرنگی محل کی ہمسری نہیں کر سکا۔ یہ تاج خسروانہ صرف اسی خاندان کو زیبا ہے۔ علامہ شبلی کا ایک جملہ ہمیشہ باز خوانی کی دعوت دیتا ہے کہ ''ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے''۔ اس کعبہ علم کے لئے یہ تقدس مآب شرف بر حق ہے۔

اصل کتاب اپنی جگہ، لیکن صاحب کتاب مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ذکر اس تفصیل سے کسی الگ جگہ شاید ہی مل سکے، سرخی بھی خوب ہے کہ ''اسلامیان ہند کا ایک گم شدہ قائد''۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اپنے عہد میں امام وقت اور قیام الملۃ والدین کہلائے، اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعری اظہار مولانا کی لوح مزار پر بجا طور پر نقش ہو گیا:

اے چرخ ہوائے شوق چلے — اے شاخ عمل گل باری کر
کچھ کام کریں کچھ سعی کریں — ہر شیخ کو عبدالباری کر

گذشتہ صدی کی اولین دو تین دہائیوں میں بر صغیر میں علمی، مذہبی، سیاسی اور سماجی ہنگامے جس طرح برپا ہوئے ان کی واقعی اور سچی جھلک دیکھنا ہو تو مولانائے فرنگی محلی کے سفر حیات کی ہر رہ گزر پر کچھ دیر ہی کے لئے سہی، ٹھہرنا ضروری ہے۔ کانگریس، مسلم لیگ، خلافت تحریک، خلافت ترکی، شریف مکہ، برطانیہ، آل سعود، فلسطین، اسرائیل، نجد و حجاز، مقامات و مآثر مقدسہ کی شکست و ریخت، کیسے کیسے عنوان اس وقت کی ملکی و ملی سیاست کے ترجمان بنتے گئے۔ مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سب مولانائے فرنگی محل کے ایوانوں میں بار بار نظر آتے رہے۔ کیا دور تھا جب مسلکی تفرقہ بندی جماعت سازی، مذہبی ٹوٹ پھوٹ، باہم عمل تکفیر و تفسیق، جگہ جگہ مناظرے اور مجادلے تھے، ایسے میں قطب اور محور کا درجہ لئے ہوئے مولانا عبدالباری کا دل ہر مذہب و مسلک کے لئے کشادہ تر ہوتا گیا۔ مولانا دریابادی کے اسلوب میں ''عقدہ اب کھلا، اللہ اکبر! یہ لیڈر فرنگیوں سے اس قدر بیزار اور ایک فرنگی محلی کے یار غار''۔

قریب پچاس صفحوں میں مولانا کی یہ حکایت آج کی نسل کے لئے لذیذ تر ہے اور صاحب قلم کی نسبت سے خوش تر بھی۔ باقی تذکرہ میں ایک ہی خاندان کے سو سے زیادہ علماء و مصنفین کا ذکر بین السطور میں خدا جانے کتنی کہانیاں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس میں ایک بات خاص طور پر اپنی جانب توجہ مرکوز کراتی ہے کہ

خاندان ملانظام الدین کے بیشتر افراد سیارہ صفت تھے، ہجرت کے اتنے عملی مظاہر شاید ہی کسی خاندان نے پیش کئے ہوں، پورے بر صغیر میں سہالی بارہ بنکی کی مٹی کی خوشبو عام ہوتی گئی، جگہ جگہ مدارس اور علمی مراکز قائم ہوتے رہے، غازی پور کا مدرسہ چشمہ رحمت ہو یا پھر آرکاٹ کے ایوان ہوں، فرنگی محلی برکتیں ہر جگہ نمایاں اور موثر۔ محقق شہیر ڈاکٹر عارف نوشاہی نے بالکل صحیح لکھا کہ ایک مختصر عربی تذکرے کو قریب پانچ سو صفحات پر پھیلا دینا تدوین و تحقیق خوشتر کا وہ اہتمام (نورانی اہتمام) ہے جس کی مثالیں بر صغیر میں انگلیوں پر گنے جا سکنے والے محققین ہی پیش کر سکے ہیں۔

خطوط مشاہیر بنام مولانا محمد عمران خاں ندویؒ: مرتب پروفیسر مسعود الرحمن خاں ازہری ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۰، قیمت ۵۰۰ روپئے، پتہ: مولانا محمد عمران خاں ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفئیر سوسائٹی بھوپال، موبائل : ۹۴۲۵۶۹۳۱۴۴ ۔ آن لائن moulanaimrankhannadwiazhari.blogspot.in طبع اول ۲۰۲۰ء

بھوپال کی مسلم ریاست کا نوابی اور بیگماتی دور گردش ایام کی نذر ہو کر تاریخ کا حصہ بن گیا لیکن ریاست بھوپال کے علماء و مشائخ کی دعوتی و تبلیغی کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، اسی سلسلہ کی نہایت درخشاں کڑی مولانا عمران خاں ندوی کی شخصیت تھی، عزم، ہمت، حوصلہ، دور اندیشی، حکمت، فراست اور سب سے بڑھ کر مطلوب لیاقت و صلاحیت کی جامع ایسی ہستیاں مشکل سے ملتی ہیں۔ مولانا کی یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ اکابر، احباب اور معاصرین کے خطوط کی نہایت احتیاط سے حفاظت فرماتے، ان کی رحلت کے بعد ان کے لائق فرزند اور قریبی اعزہ نے ان خطوط کی اہمیت کے پیش نظر ان کی اشاعت کا ارادہ و اہتمام کیا اور مشاہیر دارالمصنّفین و دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خطوط پر مشتمل دو جلدیں شائع کیں۔ زیر نظر مجموعہ کے فاضل مرتب ان سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے ان کو اشاعت نو کی فکر ہوئی۔ یہ کتاب اسی منصوبہ کی پہلی کوشش ہے۔ اس میں جماعت تبلیغ کے بزرگوں جیسے شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا محمد یوسف، مولانا انعام الحسن، مولانا محمد عمر پالنپوری، مولانا منظور نعمانی رحمہم اللہ کے خطوط ہیں۔ ان کے علاوہ منشی بشیر، مولانا جمیل قادری، ڈاکٹر خالد صدیقی اور جناب عبدالحفیظ منیار جیسے نہایت فعال اور کارگزار تبلیغی حضرات کے اور ان کے نام مولانا ندوی کے خطوط ہیں۔ کاغذ، روشنائی، طرز تحریر اور نج کی

باتیں وغیرہ عموماً خطوط کے جامعین کی راہ مشکل بنادیتی ہیں اور یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ان خطوط پر وقت کے سائے گہرے ہوچلے ہوں۔ فاضل مرتب بہر حال اس مشکل سے آسانی سے گزر گئے۔ خصوصاً ان کے حواشی اور عبارتوں کے درمیان توسینی وضاحتوں اور اہم جملوں کو جلی حروف کا پیرہن جس طرح دیا گیا اس نے اس مجموعہ کو امتیازی شان عطا کردی۔ ایک خط میں مولانا ندوی نے شیخ الحدیث سے ایسے اساتذہ کی ضرورت کا اظہار کیا جو صالح ہوں اور ایثار کی صفت بھی رکھتے ہوں۔ جواب میں حضرت شیخ نے لکھا ''ایک شرط تو میری نگاہ میں قریب قریب ناممکن سی ہوگئی، تقویٰ سے ہاتھ دھوؤ..... یہ ناکارہ تو کئی سال سے 'آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں'''۔ ایک خط میں مولانا پالنپوری لکھتے ہیں کہ ''دمشق کے عرب کی ذکاوت، مجاہدہ اور فطری اوصاف قابل رشک ہیں جو ہمارے ہاں بہت سے مجاہدوں کے بعد بھی کم میسر آتے ہیں وہ ان کی فطرت میں داخل ہیں''۔

کتاب میں ایک حصہ عمائد ملک وملت کے خطوط کا بھی ہے۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، شنکر دیال شرما، سید حامد سے ابو سعید بزمی اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری تک قریب تیس مشاہیر کے خطوط ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کی سلور جوبلی میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ''جامعہ اور ندوہ کے درمیان رشتۂ مواخات کو اور مضبوط ہونے کا موقع دیں''۔ اس پر مرتب محترم کا حاشیہ گو بے ضرورت ہے لیکن ہے کام کا۔

نقوش زندگی: مصنف: وکیل احمد انصاری ایڈوکیٹ مرحوم، مرتب ڈاکٹر محمد انور حفیظ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت عمدہ مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳۰۰ روپے، سال اشاعت: ۲۰۲۰ء، پتہ: انڈیا الخیر فاؤنڈیشن، محلہ کراکر کوٹ، بلوا گھاٹ روڈ، نزد شاہی قلعہ، جونپور۔ ۲۲۲۰۰۱ موبائل: ۸۱۷۶۹۳۳۵۶۳، ای میل: dr.m.a.hafeez@gmail.com

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے بظاہر ایک عام سی شخصیت سادگی، فروتنی، تواضع، خدمت اور مہربان تبسم سے خاص ہستی میں تبدیل ہوکر لوگوں کی نگاہوں میں سماتی رہی، مشاہیر امت کے قابل اعتماد اور نہایت لائق اعتبار وجود کے اعزاز کی حامل، ہر دینی و ملی خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار اور مستعد، اس قدر متحرک اور باعمل ہستیاں اگر بستیوں میں نظر آتیں تو شاید قوم کا عالم آج کچھ اور ہوتا، ویرانوں میں بہار اور بہاروں کو سدا

بہار بنانے اور بنائے رکھنے کا سلیقہ بھی کیا نعمت ہے جو وکیل صاحب کو قدرت سے ودیعت ہوئی، لیکن خود کو مستور و مخفی رکھنے کا ہنر بھی وہ خوب رکھتے تھے، عموماً خود نوشتوں میں خاندانی عزت، ثروت اور علمی ذوق و ماحول سے ابتدا ہوتی ہے۔ آپ بیتی سنانے والے، محنت کش، کسان یا مزدور طبقہ سے بہت کم آتے ہیں۔ وکیل صاحب کے بچپن میں گیہوں کی روٹی کبھی کبھار عید بقر عید میں مل جاتی ورنہ جو کی روٹی ہوتی۔ گوشت اور چاول کے پکنے کی نوبت سال میں دو تین بار ہی آتی۔ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کاش قوم کی اس معاشی حالت کے اسباب و علل پر بھی نگاہ ڈالتے۔ اصلاً یہی نقوش ہیں جن کے ساتھ چلتے چلتے انسان ایک کالج کے بنیاد گزار اور قومی تحریکوں میں پیش پیش صاحب علم و دانش کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ نقوش، تابندہ اسی سفر سے ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی خود نوشت حقیقت بیانی کی ایسی کوشش ہے جس سے ہر قاری کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ وکیل صاحب مرحوم کے صاحبزادے نے والد کے لئے احسان شناسی کی اچھی مثال پیش کردی۔ سچے ادب کے متلاشیوں کے لئے اس کا مطالعہ زندگی کا اجالا بن سکتا ہے۔

اجالوں میں سفر: تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی، مصنف: انتظار نعیم، ناشر: شاہ کار پبلشرز، دہلی، سنہ اشاعت: ۲۰۲۱، صفحات: ۴۲۶، قیمت: ۵۰۰ روپے۔

انتظار نعیم کی حیثیت اردو شاعر اور نثر نگار کے مسلم ہے۔ ''اے ارض فلسطین'' کے نام سے شعری مجموعہ لکھ کر انہوں نے بر صغیر کے مسلمانوں کی فلسطین سے وابستگی کو مزید مضبوط کیا ہے۔ ''دلت مسئلہ: جڑ میں کون''، لکھ کر انہوں نے دلت مسئلے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جبکہ بالعموم مسلمانوں میں اس طرح کی تحریکوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے جو تعجب کی بات ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہم پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کریں تو ہمیں بھی چاہئے کہ معاشرے میں دوسروں پر ہونے والے مظالم کے خلاف ہم بھی آواز بلند کریں۔

جماعت اسلامی کی شخصیات اور اداروں کے بارے میں انتظار نعیم نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''ایمرجنسی کی آزمائش اور جماعت اسلامی ہند'' بہت اہم ہے۔ انتظار نعیم تقریباً نصف صدی سے جماعت اسلامی سے جڑے ہوئے ہیں اور مرکز جماعت میں اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک ہفت روزہ ریڈئنس کے ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ وہ ادارۂ ادب اسلامی ہند کے نائب صدر ہیں اور اس کے ادبی ماہنامہ

''پیش رفت'' کے ۱۹۹۲ سے ۲۰۱۲ تک مدیر رہ چکے ہیں۔ وہ الفلاح اسلامک سوسائٹی، الفلاح اسلامک اسکول اور مولانا مودودی میموریل فاؤنڈیشن کے مؤسس بھی ہیں۔

زیر نظر کتاب ''اجالوں میں سفر'' ایک طرح سے ڈائری، خودنوشت، یادداشت اور پچھلے پچاس سالوں کی امت مسلمۂ ہند کی تاریخ بھی ہے۔ جماعت اسلامی کے ایک اہم ذمے دار کی حیثیت سے ان کو بہت سے مسائل اور معاملات کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس میں حکومتی معاملات بھی ہیں اور دوسری مسلم تنظیموں سے تعلقات بھی۔ ان کے بارے میں ان کے احساسات اور خود جماعت کے اندر ہونے والے بہت سے واقعات پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں امت مسلمۂ ہند بالعموم و جماعت اسلامی ہند کو بالخصوص سمجھنے کے لئے یہ کتاب بہت اہم ہوگی۔ مصنف اس لحاظ سے ہمارے شکر کے حقدار ہیں، خصوصا اس لئے کہ اس طرح کی تحریریں لکھنے اور شائع کرنے کی جماعت اسلامی ہند میں روایت نہیں رہی ہے۔

مجلہ: اردو اسٹڈیز Urdu Studies

شمارہ ۳، سال ۲۰۲۱، مہمان ایڈیٹر: ڈاکٹر مہر افشان فاروقی (یونیورسٹی آف ورجینیا)، ناشر: شعبۂ اردو، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ، بہار، صفحات: اردو: ۱۲۱، انگریزی: ۱۴۷، پرچے کا اونلائن پتہ: www.jpurdu.wordpress.com مطبوعہ مجلے کی قیمت: ۴۰۰ روپے

ہمیں اس مجلے کی پی ڈی اف فائل ملی ہے۔ مجلہ کے سرورق پر اور اندر بھی درج ہے کہ یہ ''ہم مرتبہ نظر ثانی شدہ ذولسانی تحقیقی جریدہ'' ہے۔ ''ذولسانی'' سے مراد غالبا ''دولسانی'' Bilingual ہے۔ مجلس ادارت کے ممبران اور مقالہ نگاران کی اکثریت غیر ملکی یا ہندوستان کے باہر مقیم لوگ ہیں۔ اردو اور انگریزی حصوں میں مقالات زیادہ تر ادبی اور شخصیات پر ہیں۔ ایک مقالہ سید سلیمان ندوی اور ہندوستانی زبان پر وِپن کرشنا کے قلم سے انگریزی حصے میں ہے جس میں سید صاحب کی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو مقالات کے عناوین اور مقالہ نگاروں کے نام بھی ہر مضمون کے شروع میں انگریزی میں دئے گئے ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں حصوں کے مضامین عمدہ اور سنجیدہ ہیں۔

ادبیات

ماتم گریزاں

ڈاکٹر راہی فدائی

9448166536

نہیں جنّ وملک، ارض وفلک ماتم گریزاں
کہاں حساس دل ہو دیر تک ماتم گریزاں
لہو میں تر بہ تر نور نظر کا جب جسں ہو
نہ ہو ہر گز پسینے کی مہک ماتم گریزاں
بہا خونِ غریباں اس قدر، ممکن نہیں اب
رہیں مور و مگس، مرغ و سمک ماتم گریزاں
نمازوں میں انہیں کا نام باقی، فیض جاری
نہ ہو گا اب بہترؔ کا نمک ماتم گریزاں
تصور کر نہیں سکتے، یہ ممکن کیسے ہو گا
حمیّت قوم کی، دیں کی للک ماتم گریزاں
جسد بھر تیر، نیزے خوں چکاں، کب تک رہے گی
تأسف سے بھری دل کی کسک ماتم گریزاں

غزل

محمد طارق غازی وھٹبی۔اونٹاریو۔کینڈا

غم پہ احسان کر دیا ہو گا
سچ کو قربان کر دیا ہو گا

کیا صنم ہو گا جس کو مومن نے
نذر ایمان کر دیا ہو گا

کچھ اناؤں کی پاسداری نے
دل کو ویران کر دیا ہو گا

وہ جو مسند کا اہل تھا اس کو
محض دربان کر دیا ہو گا

اس کے در پر وجود کو اپنے
خالی دامان کر دیا ہو گا

وہم ماضی ہے کل کا فرداساز
اس کو امکان کر دیا ہو گا

ایک چھوٹی سی آہ تھی دل میں
تم نے طوفان کر دیا ہو گا

خاک سے صرف دل بنایا تھا
دل نے انسان کر دیا ہو گا

حافظ و صائب و سنائی نے
بن کو ایران کر دیا ہو گا

بن اُبیٔ کی حماقتوں کا رخ
سوئے افغان کر دیا ہو گا

بکنے والے بہت بکے ہوں گے
دیس کو دان کر دیا ہو گا

ویسے منشا تھا انقلاب مگر
اس کو بحران کر دیا ہو گا

ملت غم تھی بے سروساماں
غم کا سامان کر دیا ہو گا

بم بھی چیخا کئے کہ گوروں نے
شہر سنسان کر دیا ہو گا

ابن آدم سے بغض نے اس کو
ابن شیطان کر دیا ہو گا

کیسی گلشن کی آرزو ہو گی
گھر کو گلدان کر دیا ہو گا

آج بلبل کی بے زبانی نے
گل کو حیران کر دیا ہو گا

انگنت شعر کہہ چکے طارق
اب تو دیوان کر دیا ہو

معارف کی ڈاک

(۱)

گرامی قدر جناب ایڈیٹر صاحب :سلام ورحمت۔ نومبر کا معارف باصرہ نواز ہوا۔ اللہ رب العزت پروفیسر اشتیاق احمد ظلی حفظہ اللہ کو شفائے کاملہ ،عاجلہ ، مستمرہ عطا فرمائے۔آمین۔ مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں جیسے صاحب بصیرت اسکالر نے اس نازک گھڑی میں معارف کی باگ ڈور سنبھالی ہے ۔ خدا کرے کہ موصوف کی سربراہی دارالمصنّفین اور معارف دونوں کے لیے فال نیک ثابت ہو۔آمین۔

اس شمارہ کے جملہ مقالات تحقیقی اور علمی میزان پر پورے اترتے ہیں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بیان شبلی میں پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ سخنورانِ اعظم گڑھ پر تبصرہ انتہائی معلومات آفریں ہے۔ ''صوفیہ پنجاب: ایک سوانحی خاکہ۔ایک غیر مرتب، غیر مستند ماخذ'' میں ڈاکٹر عارف نوشاہی نے نہ صرف تبصرہ بلکہ تنقید و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ کم و بیش آٹھ اہم زاویے سے کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے بے شمار لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ یہ لکھنے میں حق بجانب نظر آتے ہیں:

> معلوم نہیں مصنف اس غیر مستند اور غیر مرتب کتاب سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کے بعد کی مجوزہ جلدوں میں بھی اگر یہی منہج رہا تو یہ محض مصنف کے وقت اور گرانٹ دینے والے سرکاری ادارے اور ناشر کے پیسے کا ضیاع ہوگا۔ لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ اگلی جلدوں میں کوئی نظم قائم کریں اور ماخذ کا حوالہ دیں۔اگر مختلف تذکروں میں کسی کے حالات یا تاریخ کے معاملے میں اختلافات ہوں تو انہیں اپنی تحقیق کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان اختلافات کو پاورق میں درج کر دیں اور کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کی صواب دید پر چھوڑ دیں۔ تبھی یہ حوالے کی کتاب بن سکتی ہے ورنہ محققین اور طالب علموں کے لیے گمراہی کا سبب بنے گی۔

اس طرح کی بروقت گرفت سے دو رخی فائدہ ہوتا ہے۔اول: مصنف و محقق کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ تحقیق کے میدان میں پورے حزم و احتیاط سے قدم رکھنے لگتا ہے۔ دوم: مستقبل کے محققین اس طرح کے غلط ماخذ کا حوالہ دینے سے بچ جائیں گے۔اس سلسلے میں معارف کی عظیم الشان خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا

جس نے غلط کو صحیح سے الگ کر کے صحت مند لٹریچر کا ایسا بے بہا خزانہ فراہم کر دیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مستند ماخذ کا کام دیتا رہے گا۔ یہ حیات آفریں تحریریں ان کے ذہنوں کی آبیاری بھی کرتی رہیں گی۔

معارف کی زبان پر جناب خواجہ محمد شاہ کا ایک مراسلہ بھی توجہ کا مرکز بن گیا۔ فاضل مراسلہ نگار نے ''الفاظوں'' کا استعمال کیا ہے جب کہ لفظ کی جمع الفاظ بجائے خود کافی تھا۔ تیسرے پیرا میں وہ رقم طراز ہیں: ''مضمون نگاروں کی زبان اتنی مرقع ہوتی ہے''۔ جب کہ مرقع بمعنی البم ہے، یہاں تو ثقیل، بلیغ یا وقیع لکھنا چاہیے تھا۔ موصوف کا سارا زور زبان کو سہل بنانے پر ہے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کے ذوق کی تسکین کے لیے دوسرے رسائل مثلاً دین دنیا یا ہما ڈائجسٹ وغیرہ جیسے متبادل موجود ہیں۔

معارف سو سال سے زائد مدت سے ایک منفرد معیار کا حامل رہا ہے۔ اس کے جملہ محاسن کو پیش نظر رکھ کر اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا کا کوئی رسالہ اردو ہی نہیں دیگر کئی زبانوں میں بھی اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس میں کم عیار کے لوگ مقالات بھیجنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دینی، ادبی تاریخی اور تحقیقی رسالے نے عالمی سطح پر جو شناخت بنائی ہے اس معیار کو ایک صدی سے زائد مدت تک برقرار رکھنا توفیق الٰہی کے علاوہ کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

خوش قسمتی سے علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقا سے لے کر آج تک ایسے ایسے ارباب قلم برصغیر میں میسر آئے جنہوں نے زبان و بیان، تحقیق و تدقیق میں وہ رشحات قلم پیش کیے جن کا شمار عالمی ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ دارالمصنّفین کی جملہ مطبوعات میں بھی یہی روح کارفرما ہے جو اصلاً علامہ شبلی نعمانی کا اعجاز ہے۔ معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔ معارف کے اسی طرز نگارش نے بے شمار ارباب قلم کی ذہنی تربیت کی۔ یہ اسی رسالے کا فیضان ہے کہ لکھنے والے بھی گہرے اور وسیع مطالعے کے بعد ہی قلم اٹھاتے ہیں اور زبان و بیان نیز علم و ادب کے موتی رولتے ہیں۔ انہیں قدم قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ ذی علم حضرات کی نظر سے یہ مقالہ گزرے گا۔ ان تمام تر خوبیوں نے اسے دنیا کا سب سے معیاری دینی، ادبی، تاریخی و تحقیقی رسالہ بنا دیا۔ فاضل مکتوب نگار کو شذرات بھی عسیر الفہم نظر آئے۔ جب کہ اس کے برعکس شذرات کی زبان ہمیشہ سلیس و رواں لیکن عالمانہ رہی ہے۔ زیادہ دور کیوں جایئے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور جناب محمد عمیر الصدیق کے رشحات قلم پڑھ لیں جن پر آبشار کا گمان ہوتا ہے۔ ابھی چند ماہ پیشتر شذرات ہی میں موخر الذکر نے برہان پور کا سفر نامہ پیش کیا تھا جسے پڑھ کر میں عش عش کر اٹھا۔ اسے انشائیہ کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ برسہا برس کی کاوشوں کو بیک

جنبش قلم ختم کرنا کسی طرح زیبا نہیں۔ مقالہ جتنا علمی و تحقیقی ہوگا زبان بھی خود بخود بلیغ اور عالمانہ ہوتی جائے گی۔ یہ رسالہ جس حلقے میں معروف و مقبول ہے وہ لوگ نہ صرف اس کی زبان و بیان سے مطمئن ہیں بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور بھرپور استفادہ بھی کرتے ہیں۔ لہذا اسے عوامی رسالہ بنانا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

باب التقریظ والانتقاد کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ اس سے طلبہ اور اساتذہ دونوں کو روشنی ملتی ہے۔ مقالات کے اختصار یا طوالت کا اختیار برقرار رکھنا چاہیے۔ اسے مقالہ نگار کے صواب دید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بسا اوقات مبسوط مقالات کو سمیٹنے میں اصل مقصد ہی فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تاہم ناگزیر حالات میں اختصار کا مشورہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مقالہ نگار کے تعارف کا التزام ضروری ہے۔ کیونکہ مقالہ نگار کی تمنا ہوتی ہے کہ میں پہچانا جاؤں اور قاری کو بھی بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے کہ میں کس عالی مرتبت ادیب کی تحریر سے شادکام ہو رہا ہوں۔

چند معروضات طباعت کے بارے میں بھی پیش کرنا ضروری ہیں: مضمون صرف ورڈ پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق، فونٹ پوائنٹ ۱۵ میں بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جب کہ اِن پیج میں نوری نستعلیق اس فونٹ میں زیادہ جلی، روشن اور پرکشش ہوتا ہے۔ دارالمصنّفین میں منجھے ہوئے کمپیوٹر کمپوزر عرصۂ دراز سے کام کر رہے ہیں جو اس کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی خدمات حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ مزید برآں ایم-ایس-ورڈ سے مقالہ نگاروں کو بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورڈ کے کمپوزر بآسانی دستیاب نہیں ہیں اور اگر مل بھی گئے تو کمپوزنگ کے تقاضوں کو باحسن الوجوہ پورا نہ کرسکیں گے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے عربی، فارسی اور اردو میں اشعار جہاں ہم وزن ہوتے ہیں وہیں ہم حجم بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے جو اسے انگریزی شاعری سے متمائز کرتی ہے۔ نغمگی اور موسیقیت تو آزاد شاعری میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن صوری حسن جملہ اشعار کے حجم میں یکسانیت پیدا کرکے ہی ظہور میں آتا ہے۔ ورڈ میں اشعار کو پورے کالم میں پھیلانے کی صلاحیت غالباً نہیں ہوتی ہے جس کا مظاہرہ صفحات ۳۴۷، ۳۸۰ اور ۳۸۱ پر ہوا ہے۔ اس کے برعکس ان پیج میں پورے کالم میں پھیلانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ اشعار کی درگت دیکھ کر بڑا تکدر رہا۔

راقم الحروف کم و بیش نصف صدی سے معارف کا قاری ہے۔ اسی نسبت سے چند طالب علمانہ سطور میں اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار کر دیا۔ اگر کوئی بات ناگوار خاطر ہو تو ازراہِ کرم معاف فرما دیجیے گا۔

ڈاکٹر شفقت اعظمی
azmikas@gmail.com

معارف: ''باب التقریظ والانتقاد'' ختم نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کا نام ''تبصرۂ کتب'' رکھ دیا گیا ہے جو زیادہ آسان اور قریب الفہم ہے۔ بڑے اور چھوٹے دونوں تبصروں کو اسی باب میں ضم کر دیا گیا ہے۔ دنیا کے ہر علمی مجلے اور علمی کانفرنس کے لئے مقالات کے صفحات یا الفاظ کی حد مقرر ہوتی ہے۔ کوشش یہ ہے کہ تحریریں نہ اتنی چھوٹی ہوں کہ ان میں عالمانہ بحث نہ ہو سکے اور نہ اتنی مفصل ہوں کہ کتاب بن جائے۔ کتاب کو بہر حال الگ سے بطور کتاب ہی چھپنا چاہئے۔ بہت لمبی تحریروں سے دوسرے اہل قلم کی بھی حق تلفی ہوتی ہے کیونکہ دو تین تحریروں میں پورا شمارہ بھر جاتا ہے جب کہ ہر شمارے کے صفحات کی تعداد مقرر ہے اور کئی دوسرے امور کے لئے بھی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔

مقالہ نگار کا تعارف نومبر ۲۰۲۱ کے شمارے میں رہ گیا تھا۔ اب ہر مقالہ نگار کے بارے میں اس کے نام کے نیچے ایک لائن رہے گی جس سے اس کا اجمالی تعارف ہو جائے گا اور اس کا ایمیل یا موبائل نمبر بھی رہے گا۔

ورڈ پروگرام بہت سی خصوصیات کا حامل ہے اور یونیکوڈ ہونے کی وجہ سے اس کو بہت طرح سے مثلا ایمیل میں اور ویب سائٹ پر بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ یہ سہولت ان پیج میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ورڈ میں فارمیٹنگ کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اسی وجہ سے ساری دنیا کی اکثر زبانوں میں آج کام ورڈ میں ہو رہا ہے۔ جو لوگ دونوں پروگراموں سے واقف وہ جانتے ہیں کہ ان پیج کتنا محدود اور مشکل پروگرام ہے۔ آج بعض لوگ ان پیج کے بارے میں جو بات کہہ رہے ہیں بعینہ وہی بات ۲۰-۲۵ سال قبل کمپیوٹر کمپوزنگ کے بارے میں کہی جاتی تھی کہ کتابت اس سے بہتر ہے۔ کتابت کے خاتمے سے اردو نشر و اشاعت کو بہت فائدہ ہوا۔ کمپوزر حضرات کو ورڈ میں مہارت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی بلکہ اس سے ان کا کام بہت آسان ہو جائے گا اور مستقبل میں ایسے مضامین کو کہیں اور استعمال کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ آج دنیا کے اکثر اہل قلم ہر زبان میں ورڈ ہی میں کام کر رہے ہیں۔ فارمیٹنگ کا کام بہر حال ٹکنیکل ہے اور اسے بھی کسی کمپیوٹر کے ماہر شخص کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی ہے اور یہ کام معارف کے آفس میں اشاعت سے قبل انجام پاتا ہے۔ ورڈ میں اشعار کے حجم میں یکسانیت پیدا کرنا ضرور ایک مسئلہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کا بھی حال

نکل آئے گا۔ عربی ورڈ میں اس کا حل موجود ہے جبکہ اردو میں غالباً نہیں ہے (ایڈیٹر)

(۲)

جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام خان صاحب: السلام علیکم

ابھی مجھے معارف کے نومبر ۲۰۲۱ شمارے کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مقالات کے آخر میں حواشی کی نئی سیٹنگ کی تحسین ہونی چاہئے کیونکہ یہ قارئین کے لئے مفید ہے۔ یہ میری اور دوسرے قارئین کی عرصے سے خواہش رہی ہے۔ معارف میں تبصرے کے لئے موصولہ کتابوں کے بارے میرا حقیر مشورہ ہے کہ کتابوں کو تاریخ وار ایک رجسٹر میں درج کیا جائے اور کتب موصولہ میں اسی ترتیب سے ان کا ذکر ہو۔ ان میں سے کچھ کتابوں کو تبصرے کے لئے رکھ لیا جائے اور تبصروں کو بھی اسی ترتیب سے شائع کیا جائے۔ آپ کی نظامت میں اکیڈمی کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، علیگڑھ
zafarul.islam@gmail.com

معارف: جزاک اللہ۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ کم از کم ظاہری شکل میں معارف میں شائع ہونے والے مقالات آج کے مقبولہ اکیڈمک معیار کے مطابق ہو جائیں۔ ایسے امور میں ہم کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہئے۔ اسی وجہ سے میں نے فرسودہ ان پیج کو چھوڑ کر ورڈ میں کام شروع کرایا ہے کیونکہ اس میں بہت سی سہولتیں دستیاب ہیں جو ان پیج میں میسر نہیں ہیں۔ ورڈ کا میٹر یونیکوڈ میں ہوتا ہے جس کی وجہ اس کو طرح طرح سے بعد میں استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ یہ ان پیج میں نہیں میسر ہے۔ اس وجہ سے آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ اب حاشیے اسی صفحے کے نیچے نظر آ رہے ہیں جبکہ یہ ان پیج میں ممکن نہیں ہے۔ حواشی کے مکونات اور معلومات کی ترتیب کو بھی موجودہ اکیڈمک مجلات کے معیار کے مطابق بدلا جا رہا ہے۔ کچھ مشکلات ضرور پیش آ رہی ہیں کیونکہ لوگ نئے طور طریقوں کو سیکھنا نہیں چاہتے ہیں اور زیادہ بہتر تکنیک کو اپنانا نہیں چاہتے ہیں۔ موصولہ کتابوں کا اب ایک رجسٹر رکھا جائے گا جس میں تبصرے کے لئے آنے والی کتابوں کو تاریخ وار درج کیا جائے گا۔ براہ کرم معارف اور دارالمصنفین کے سلسلے میں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں تاکہ ان کے معیار کو مزید بلند کیا جا سکے نیز آپ خود معارف کے لئے لکھیں اور دیگر اسکالرز و اساتذہ کو اس کے لئے آمادہ کریں۔ اگر کچھ عمدہ ڈاکٹریٹ کے مقالات ہوں تو اکیڈمی ان کو بھی شائع کرنے پر غور کرے گی۔ اگر اکیڈمی کے حالات بہتر ہوئے تو ڈاکٹریٹ کے طلبا اور دوسرے اسکالرز کے لئے اسکالر شپ اور مالی مدد بھی اکیڈمی انشاء اللہ جاری کرے گی۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

(۳)

برادر مکرم: السلام علیکم۔ میں نے معارف کے دسمبر ۲۰۲۱ کے شمارے کے تبصروں پر نگاہ ڈالی۔ بہتر ہو گا کہ ہر کتاب کے ساتھ اس کی سن اشاعت کا ذکر بھی ہوتا جیسا کہ اسی شمارے میں انگریزی کتابوں کے تبصرے میں موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حواشی کی نمبرات اگر انگریزی کے بجائے اردو میں ہوتے تو اچھا ہوتا۔ یہاں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اردو میں قرآنیات اور مطالعات حدیث کے لئے لاہور میں بنی ہوئی ایک ویب سائٹ ہے جس کا پتہ ہے: www.kitabosunnat.com۔ دعا کی درخواست کے ساتھ۔

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، علیگڑھ
zafarul.islam@gmail.com

معارف: وعلیکم السلام۔ آپ کی تنبیہ کے لئے جزاک اللہ۔ انشاء اللہ نئے سال سے معارف کے شماروں میں کتابوں کے تبصروں کے تحت کتابوں کی سال اشاعت بھی مذکور رہے گی۔ معارف کے حاشیوں کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ ورڈ پروگرام میں حواشی کے نمبرات انگریزی میں بطور ڈیفالٹ آتے ہیں (یعنی یہ پروگرام کا جزء ہے)۔ اس مسئلے کے حل کے بارے میں ٹکنیکل مدد حاصل کروں گا۔

والسلام۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان [1]

مطبوعات دارالمصنفین

فقہی کتابیں

تاریخ فقہ اسلامی

مترجم: مولانا عبدالسلام ندوی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہا پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے۔ صفحات ۴۷۱/ قیمت ۳۵۰ روپے

[1] اوپر کے دونوں خطوط اور ان کے جوابات انگریزی میں تھے جن کا یہ اردو ترجمہ ہے۔

رسید کتب موصولہ

اسفار اربعہ (حصہ دوم): صدر الدین شیر ازیؒ، مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تحقیق و ترتیب، ڈاکٹر محمد رفیع الدین فاروقی، شان پبلی کیشنز، طاہر ولا، یوسف گوڑہ، حیدر آباد۔ سال اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت ۱۶۵۰ روپے

الاصول الثلاثہ: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ سال اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت ۸۰ روپے

بولنا ہی ہے: (ہندی)۔ رویش کمار، راج کمل پرکاشن، پرائیویٹ لمیٹیڈ، نیتا جی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی۔ طبع چہارم ۲۰۲۱ء، قیمت ۲۵۰ روپے

تحریک شہیدین کے اردو ادب پر اثرات: مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، ٹیگور مارگ، نزد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت ۹۰ روپے

تخیلات بسمل: فیض الحسن بسمل، جاوید اختر، جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو۔ سال اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت درج نہیں۔

ثانی سہراب: شورش کاشمیری (فکر و فن) محمد مرسلین اصلاحی، البدر بک ڈپو، سرائمیر، اعظم گڑھ۔ سال اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت ۱۶۲ روپے

حضور ﷺ کا سفر آخرت: مفتی محمد عمر شفیق ندوی، مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ سال اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت ۲۰۰ روپے

مجالس سید ابوالاعلیٰ مودودی: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۔ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت ۲۵۰ روپے

معین الدین احمد ندوی کی یاد میں: سید صباح الدین عبدالرحمن، مرتب: انس بلال ندوی۔ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت ۲۵۰ روپے

نقوش معنی: پروفیسر خالد محمود، تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ سال اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔

****

مضمون نگاروں کے لیے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، ۱۴ پوائنٹ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ / صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	250/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		100/-
سفر نامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		----
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی)	//	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	//	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	//	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	//	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	//	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	//	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	//	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبد السلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	200/-
مکاتیب شبلی اول	//	150/-
مکاتیب شبلی دوم	//	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974-7346 Maaraif (Urdu) Print **JANUARY 2022** Vol. 209/1

RNI No. 13667/57 MAARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibi Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
۲۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۳۔ مطالعاتِ شبلی	اشتیاق احمد ظلی	550/-
۴۔ حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۵۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
۶۔ آپ بیتی (مرتب: ڈاکٹر خالد ندیم)	علامہ شبلی نعمانی	325/-
۷۔ امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
۸۔ حیاتِ سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
۹۔ تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
۱۰۔ تذکرۃ المحدثین دوم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	225/-
۱۱۔ تذکرۃ المحدثین سوم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	300/-
۱۲۔ محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	120/-
۱۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۱۴۔ ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
۱۵۔ تاریخ اسلام اول و دوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	375/-
۱۶۔ تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۷۔ تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندوی	400/-
۱۸۔ تاریخ صقلیہ دوم	سید ریاست علی ندوی	400/-
۱۹۔ اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
۲۰۔ یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	100/-